دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۷ ماہ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ مطابق ماہ جون ۲۰۱۱ء عدد ۶

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

علامہ شبلیؒ کے علم و فضل، مقام و مرتبہ اور ان کی عظیم خدمات اور اکتسابات کے باعث معاشرہ کے ذی شعور افراد میں فطری طور پر ان کی سوانح حیات اور ان کے گوناگوں کارناموں کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ اردو داں طبقہ کے لیے جانشین شبلیؒ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شاہ کار تصنیف "حیات شبلیؒ" نے بہت پہلے نہایت بھرپور طریقہ پر اس ضرورت کی تکمیل کا سامان کر دیا تھا۔ "حیات شبلیؒ" ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی اور عملاً سید صاحبؒ کی آخری تصنیف قرار پائی۔ آزادی کے بعد کے بدلے ہوئے حالات میں خاص طور سے انگریزی اور ہندی میں علامہؒ کی سوانح حیات کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی اور مختلف حلقوں سے اس کا تقاضا بھی ہوتا رہا۔ انگریزی میں اس ضرورت کی تکمیل کی سعادت ڈاکٹر جاوید علی خاں، اعزازی رفیق دارالمصنفین اور صدر شعبہ تاریخ شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کو حاصل ہوئی۔ انگریزی میں ان کی مرتب کردہ سوانح حیات ۲۰۰۴ء میں شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ البتہ ہندی میں مولانا کی سوانح حیات کا قرض اکیڈمی پر ہنوز باقی تھا۔ یہ بات باعث مسرت و اطمینان ہے کہ گذشتہ دنوں اکیڈمی نے ہندی میں مولانا کی ایک مختصر سوانح حیات شائع کر دی ہے۔ ہم جناب بابر اشفاق، استاذ شبلی کالج کے ممنون ہیں جن کی توجہ سے یہ کام انجام پایا۔ گذشتہ کچھ دنوں سے اکیڈمی کی تعمیر نو کے مقصد سے جو کوشش کی جارہی ہے اس میں اکیڈمی کی شہرۂ آفاق کتابوں کے انگریزی اور ہندی ترجمہ کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ بحمد اللہ اس سلسلہ کا آغاز سیرت پاک پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مقبول عام کتاب "رحمت عالمؐ" سے کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے اور دوسرا ایڈیشن جلد آنے والا ہے۔ انگریزی اور ہندی میں کئی اور ترجمے تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں اور جیسے جیسے حالات اجازت دیں گے ان کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا، انشاء اللہ۔ دعا ہے کہ اس بڑے منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے درکار ضروری وسائل کی فراہمی کے اسباب پیدا ہوں۔

دارالمصنفین کی لائبریری میں مخطوطات کا بھی ایک شعبہ ہے۔ یہاں محفوظ مخطوطات کی

تعداد تو بہت زیادہ نہیں ہے لیکن ان میں بعض نہایت اہم مخطوطات شامل ہیں۔قدیم مخطوطات کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظامات کی ضرورت ہوتی ہے۔چنانچہ اکیڈمی کے سامنے ان کی مناسب دیکھ ریکھ اور حفاظت کا ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔وسائل کی قلت کے باعث اکیڈمی کے لیے اس میدان میں دستیاب جدید سہولیات اور ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں تھا۔اکیڈمی کی تعمیر نو کے منصوبہ میں فطری طور پر اس بیش بہا سرمایہ کی حفاظت کا مسئلہ بھی شروع ہی سے شامل رہا ہے۔نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے تعاون سے اس سلسلہ میں کچھ ابتدائی اور بنیادی نوعیت کے انتظامات کیے جاچکے ہیں اور آیندہ دنوں میں اس میں مزید پیش رفت کی توقع ہے۔اسی مقصد سے مخطوطات کے نیشنل کمیشن سے بھی رابطہ کیا جارہا ہے اور توقع ہے کہ اس کے مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔مخطوطات کی حفاظت اور ان سے استفادہ کو آسان بنانے کے مقصد سے آج کل ڈیجی ٹائیزیشن (Digitization) کی ٹکنالوجی کو عام طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ابتداء ہی سے تھی لیکن اس پر آنے والے مصارف سدراہ بنے رہے اور اس اہم ضرورت کی تکمیل کی کوئی صورت نہ بن سکی۔اس مقصد سے ملک اور بیرون ملک اس میدان میں کام کرنے والے کئی اداروں سے بھی رابطہ قائم کیا گیا لیکن اس سلسلہ میں کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوسکی۔

دہلی میں متعین سعودی کلچرل اتاشی ڈاکٹر محمد ابراہیم البطشان کی گذشتہ سال اکیڈمی میں آمد کی مناسبت سے ان کا کسی قدر تعارف کرایا جاچکا ہے۔ڈاکٹر البطشان صاحب علم بھی ہیں اور علم دوست بھی،عربی زبان و ادب میں درس و تدریس اور تحقیق و تصنیف کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔مخطوطات سے خصوصی دلچسپی ہے اور اس میدان میں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔دارالمصنفین کے بڑے قدرشناس ہیں اور اس کی تعمیر و ترقی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ان کی توجہ اور تعاون سے ابھی چند دنوں پہلے اکیڈمی کی لائبریری میں محفوظ مخطوطات کے ڈیجی ٹائیزیشن کا کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔مخطوطات کی حفاظت کے سلسلہ میں یہ ایک بہت اہم پیش رفت ہے اس کے لیے ہم ڈاکٹر بطشان صاحب کے ممنون ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ دارالمصنفین کے ساتھ ان کی دلچسپی اور تعاون کا سلسلہ قائم رہے گا۔

علامہ شبلیؒ نے جن مقاصد کے پیش نظر دارالمصنفین کے قیام کا منصوبہ بنایا تھا اس سے اس ادارہ

کے قدر شناس بخوبی واقف ہیں۔ جب اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کی تاسیس کا فیصلہ ہوگیا تو اس بالکل ابتدائی دور میں جب کہ مولاناؒ کے باغ اور بنگلہ کا وقف نامہ ابھی تیاری کے مرحلہ میں تھا۔ دارالمصنفین کے مستقبل کے مہمانوں کی میزبانی کے لیے ایک مختصر سا دارالضیوف تیار ہو چکا تھا۔ اس طرح دارالمصنفین کی نسبت سے جو پہلی عمارت تعمیر ہوئی وہ دارالضیوف تھا۔ اس سے دارالمصنفین کے سلسلہ میں مولانا شبلی کے تخیل کا بھی کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گو کہ اس کا بنیادی مقصد اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی ایک جماعت پیدا کرنا اور بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ کا اہتمام کرنا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ وہ اس کو ایک ایسا علمی اور تحقیقی مرکز بنانا چاہتے تھے جہاں ملک کے طول و عرض سے اہل علم آئیں اور یہاں کی لائبریری اور محققین سے مستفید ہوں اور یہاں کے طلبہ اور اسکالرز ان سے فیض یاب ہوں۔ اس مہمان خانہ کی شکل و صورت وقت کے ساتھ بدلتی رہی اور یہ واقعہ ہے کہ پورے خطے میں اپنی نوعیت کا یہ تنہا مہمان خانہ تھا۔ دارالمصنفین کے اچھے دنوں میں اس مہمان خانہ کو مرجعیت حاصل رہی ہے وہ بے مثال ہے۔ برصغیر کی ملت اسلامیہ کی شاید ہی کوئی قابل ذکر شخصیت ایسی ہو جس کے قیام کا افتخار اس مہمان خانہ کو حاصل نہ ہوا ہو۔ اسی طرح تحریک آزادی کے زعماء میں سے اکثر بڑے قائدین یہاں باقاعدگی سے قیام کرتے رہے ہیں۔ مطالعہ و تحقیق کے مقصد سے آنے والے طلبہ اور اسکالرز کے لیے تو یہ بنا ہی تھا۔ ماضی قریب میں جب وسائل کی شدید قلت نے اکیڈمی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا تو مہمان خانہ بھی خستہ حالی اور اضمحلال سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ گو کہ بہت سے اہل علم اس کی تمام تر خستہ حالی کے باوجود بہتر مہمان خانوں کے باوجود اسی میں قیام کو ترجیح دیتے رہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بنیادی سہولتوں کے فقدان کے باعث یہاں آنے اور ٹھہرنے والے طلبہ و اسکالرز کا سلسلہ کم ہوتا چلا گیا۔ گذشتہ دنوں جب اکیڈمی کی تعمیر نو کا منصوبہ بنایا گیا تو مہمان خانہ میں ضروری تعمیر، مرمت اور بنیادی سہولیات کی فراہمی کو ابتدائی ترجیحات میں شامل کیا گیا۔ گذشتہ ایک سال سے زائد عرصہ سے اس پر کام ہو رہا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ کام پورا ہوگیا ہے اور رہائشی کمروں میں بنیادی سہولیات فراہم کردی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ایک کشادہ کچن اور ڈائننگ ہال کی تعمیر کی گئی ہے۔ اب یہ مہمان خانہ ماضی کی طرح اہل علم کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہے۔

مقالات

احمد بن یحییٰ بلاذری اور ان کی فتوح البلدان میں روایات سیرت - ایک جائزہ

کلیم صفات اصلاحی

فتوح البلدان تیسری صدی ہجری کے مشہور مورخ علامہ بلاذری کی مشہور، اہم اور اسلامی تاریخ کی معتبر اور مستند کتاب ہے، بلاذری مشہور سیرت نگار محمد بن سعد کاتب الواقدی کے شاگرد اور کتاب الفہرست کے مصنف ابن ندیم کے استاذ ہیں۔ سیرت سے خاص دلچسپی کا مظہر ان کی کتاب "کتاب انساب الاشراف" ہے لیکن اس مضمون میں فتوح البلدان میں موجود معلومات و واقعات سیرت کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ مقصود ہے لیکن اس سے قبل بلاذری کے حالات زندگی پر مختصر نگاہ ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نام، ولادت اور نشو و نما: بلاذری کا پورا نام ابوجعفر احمد بن یحییٰ بن جابر ہے، البلاذری نسبت اور کنیت ابوالحسن ہے (۱)، صاحب معجم الادباء نے لکھا ہے کہ احمد بن یحییٰ بن جابر عالم، فاضل، شاعر اور محتاط ماہر انساب تھے (۲)، خیر الدین زرکلی کی تحقیق ہے کہ بلاذری مورخ اور جغرافیہ داں تھے (۳)، سن و جائے ولادت کے متعلق مذکورہ معتبر کتابیں خاموش ہیں البتہ ایم جے ڈی خویہ کی تحقیق کے مطابق بغداد میں ان کی نشو و نما ہوئی، وہ رقم طراز ہے:

> "مولف (بلاذری) کے حالات زندگی تراجم کی کتابوں میں گو ایک سے زائد مقامات پر درج ہیں لیکن ہمیں ان میں سے صرف چند کتابوں میں کچھ اقتباسات ملے ہیں کیونکہ اکثر کتابیں اب ناپید ہیں، لکھتے ہیں:

مؤلفین تراجم نے اس کے نام میں اختلاف کیا ہے، بعض کہتے ہیں اس کا نام احمد تھا اور بعض کچھ اور کہتے ہیں لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ وہ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں پیدا ہوا، بغداد میں پرورش پائی اور یہیں کے اکابر سے علوم کی تحصیل کی"۔(۴)

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مضمون نگار نے کتاب الوزراء جہشیاری کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ نویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے کے آغاز ہی میں پیدا ہوا ہوگا...... چونکہ اس نے فارسی کی کتاب (عہد اردشیر) کا عربی میں ترجمہ کیا تھا اس لیے بلا ثبوت یہ فرض کرلیا گیا کہ وہ نسلاً ایرانی تھا (۵)، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے اس ضمن میں مندرجہ ذیل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

"احمد بن یحییٰ البلاذری (متوفی ۲۷۹) تیسری صدی ہجری کے مشہور مورخ ہیں، انہوں نے بغداد میں نشو ونما پائی اور وہاں کے نامور علماء ابن سعد اور المدائنی وغیرہ سے علم حاصل کیا تھا"۔(۶)

بلاذری کی وجہ تسمیہ: بلاذری کی وجہ تسمیہ کے متعلق تذکرہ نگاروں کے بیانات تقریباً متفق اللفظ ہیں، ابن ندیم اور مرزبانی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اس نے بھلانوے (بلاذر) نامی پھل کے دانے کھا لیے تھے جس کے سبب وہ جنون وفتور ذہن کا شکار ہو گیا تھا، یہاں ڈی خویہ کی تحقیق نقل کی جاتی ہے۔اس نے لکھا ہے کہ بلاذری نے بھلانوے (بلاذُر) کے چند دانے کھا لیے جس کے سبب اس پر جنون کے دورے پڑنے لگے اور اسی میں اس کی موت ہو گئی تو اس کے معاصرین کو بہت صدمہ ہوا اور انہوں نے جس پھل کے کھانے سے اس کی موت واقع ہوئی اسی کی نسبت سے اس کا نام بلاذری رکھ دیا۔مقصد یہ تھا کہ وہ بلاذر کی نذر ہوا (۷)، اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احمد بن یحییٰ کو بلاذری نام سے شہرت ان کی موت کے بعد ملی، جب تک وہ زندہ رہے ابو جعفر احمد بن یحییٰ ہی کہے جاتے رہے۔

اساتذہ: صاحب معجم الادباء نے تاریخ ابن عساکر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بلاذری نے دمشق میں ہشام بن عمار اور ابو حفص عمر بن سعید سے، حمص میں محمد بن مصفی سے، انطاکیہ میں محمد بن عبدالرحمٰن بن سہم اور احمد بن مرو انطاکی سے، عراق میں عفان بن مسلم، عبدالاعلیٰ بن حماد،

علی بن مدینی، عبداللہ بن صالح عجلی، مصعب الزبیری، ابوعبید القاسم بن سلام، عثمان بن ابی شیبہ، ابوالحسن علی بن محمد المدائنی، محمد بن سعد کاتب الواقدی سے کسب فیض وسماع حدیث کیا (۸)، اس سے بلاذری کے طلب وتحصیل علوم کا اندازہ ہوتا ہے۔

تلامذہ: بلاذری نے اپنے عہد کے مشاہیر وعلماء سے استفادہ کیا اور اس علمی امانت کو اپنے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کو درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ بھی انجام دیا، چنانچہ ان کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کثیر التعداد شاگردوں میں ابن ندیم صاحب کتاب الفہرست اور جعفر ابن قدامہ صاحب کتاب الخراج جیسے صاحبان علم وفضل کے نام شامل ہیں۔ فتوح البلدان کے محقق ڈی خویہ نے یاقوت کی معجم الادباء، ابن عساکر کی تاریخ دمشق اور ذہبی کی کتاب المیدان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بلاذری سے محمد بن ندیم، احمد بن عمار، جعفر بن قدامہ، یعقوب بن نعیم، عبداللہ بن ابی سعد الوراق، محمد بن خلف اور وکیع القاضی وغیرہم نے اکتساب علم کیا تھا۔ (۹)

تحقیق روایات کے لیے سفر: سطور بالا میں بلاذری کے اساتذہ کی فہرست سے ان کے شوق وذوق علم کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ تحقیق روایات اور حصول علم کے لیے سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کا بھی پتہ چلتا ہے، ایم ۔ جے ڈی خویہ لکھتے ہیں:

> ”اس کی اکثر روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انہیں پوری طرح قابل اعتبار ولائق سند بنانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، اس نے بغداد کے معتبر علماء ہی سے ان کی سماعت پر اکتفا نہیں کی بلکہ (ان کی تحقیق کے لیے) سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور گم کردہ حقیقت مطلوبہ کی تلاش میں سمندر عبور کیے“۔

آگے بلاذری کے شاگرد ابن ندیم کا یہ قول نقل کیا ہے:

> ”وہ (بلاذری) شمال الشام کے تمام شہروں میں پھرا اور وہاں سے مابین النہرین (یعنی الجزیرہ) کے شہروں کی طرف گیا اور تکریت کی سیاحت کی، اس سے مقصد یہ تھا کہ ان مقامات کے باشندوں میں جو روایتیں محفوظ ہیں انہیں جمع کرکے ان روایتوں سے ان کا مقابلہ کریں جو انہوں نے علمائے بغداد سے

حاصل کی تھیں"۔(۱۰)

دربار خلافت سے وابستگی: حالات بلاذری کی تحقیق میں بتایا گیا کہ وہ عباسی خلیفہ المتوکل کے جلیس وندیم تھے، المستعین سے بھی ان کو تقرب حاصل تھا، خلیفہ المعتز کے زمانہ میں ان کی مزید قدر ومنزلت بڑھی اور خلیفہ نے ان کو اپنے بیٹے (ابوالعباس عبداللہ) کا اتالیق مقرر کیا، اس طرح ان کو تین مشہور عباسی خلفاء کے دربار میں باریابی حاصل رہی۔(۱۱)

وفات: تمام تذکروں میں بلاذری کی وفات کے متعلق ہے کہ انہوں نے آخر عمر میں بلاذر نامی پھل کے دانے کھالیے تھے جس کے سبب ان کی حالت غیر ہوگئی، شفاخانے میں علاج کے لیے داخل بھی کیا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکے اور اسی مرض میں خلیفہ معتمد کے زمانہ (۲۷۹ھ) میں ان کی وفات ہوئی (۱۲)، ان کی لاش سُر من رأی لائی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔(۱۳)

تصنیفات: بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ بلاذری بلاد اسلامیہ کی تاریخ کی تدوین وتحقیق میں اس وقت سے مشغول تھے، (۱۴) جب ان کے ناخن نرم تھے، (۱۵) ان کے شاگرد ابن ندیم نے ان کی مشہور کتابوں میں کتاب البلدان الصغیر، کتاب البلدان الکبیر جس کو وہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے، کتاب الاخبار والانساب، کتاب عہد اردشیر جس کا انہوں نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، کا ذکر کیا ہے، (۱۶) کتاب البلدان الکبیر کے متعلق ڈی خویہ نے حاجی خلیفہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ بلاذری نے مرنے سے پہلے بڑی کتاب (کتاب البلدان الکبیر) کے لیے بہت سارا مواد جمع کیا تھا جس سے چالیس جلدوں پر مشتمل ایک عظیم الشان کتاب مرتب ہوجاتی۔(۱۷)

بلاذری کا اسلوب: بلاذری کا خاص میدان تاریخ، جغرافیہ اور علم انساب ہے، ان کی جمع کردہ روایتوں میں ان علوم سے گہری واقفیت کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے، فتوح البلدان میں ان کا کوئی مقدمہ یا دیباچہ نہیں ہے جس سے اندازہ ہو کہ انہوں نے اس کی ترتیب وتدوین میں کون سے اصول پیش نظر رکھے ہیں اور غالباً اس زمانہ میں اس کا رواج بھی نہیں تھا، البتہ بالاستیعاب مطالعہ سے ان کے بعض تنقیدی اصولوں کی جانب اشارے ملتے ہیں جن سے ان کی ناقدانہ نظر اور رطب ویابس میں فرق وتمیز کی صلاحیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے مثلاً انہوں نے کتاب کے پہلے

جملہ میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں ایجاز کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور محدثین و علمائے سیر کے بیانات کو اختصار سے پیش کیا گیا ہے اور سیاق و سباق کو درست کر کے ترتیب بدل دی گئی ہے (۱۸)،

قال احمد بن یحییٰ بن جابر اخبرنی جماعة من اهل العلم بالحدیث و فتوح البلدان سقت حدیثهم واختصرته ورددت من بعضه علی بعض ، مثال کے طور پر ابن سعد اور سیرت کی دوسری کتابوں میں آنحضورﷺ کے قبا تک پہنچنے کی بڑی تفصیلات ہیں کہ رسول اللہﷺ مکہ سے روانہ ہوئے تو قبا تک آپﷺ کن کن علاقوں اور مقامات سے گذرے، ان میں تقریباً تمام مقامات اور ان مقامات میں پیش آنے والے واقعات کی جزوی معلومات ہیں (۱۹) لیکن بلاذری نے صرف اتنا لکھا ہے کہ رسول اللہﷺ نے جب مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو قبا میں کلثوم بن الہدم کے یہاں قیام فرمایا اور اس وقت سعد بن خیثمہ سے آپﷺ مصروف گفتگو تھے لوگوں نے سمجھا کہ آپﷺ نے انہیں کے یہاں قیام فرمایا ہے (۲۰)، اسی طرح ایک جلی عنوان قائم کر کے اس کے ذیل میں متعدد روایتیں مع اسناد نقل کر دی ہیں، اموال بنی نضیر، خیبر، فدک، ذکر حفائر مکہ وغیرہ کے تحت اس سلسلہ کی روایتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جو روایتیں زیادہ مشہور ہیں یا جن راویوں کی کڑیاں نہیں ملتیں تو لفظ قال یا قالوا لکھ کر روایت شروع کر دی، مثلاً جب ۴ھ میں آپﷺ بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے اور وہاں چکی کا پاٹ پھینک کر آپﷺ کو شہید کر دینے کی سازش رچی گئی، اس روایت کے سلسلہ سند کو بلاذری نے نظر انداز کر کے صرف لفظ قال سے شروع کر دیا لیکن اس قسم کی روایتیں قابل لحاظ حد تک کم ہیں، بعض روایتیں صرف مشہور سیرت نگاروں کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں، جیسے قال الواقدی، قال المدائنی وغیرہ، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی نظر آئی کہ روایتوں میں مذکور بعض اہم اور مشہور اشخاص کو پورے نسب کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ نام کی وجہ سے جو اشتباہ پیدا ہو وہ زائل ہو جائے اور پتہ چل جائے کہ راوی مذکور کس خاندان یا قبیلہ کا شخص ہے، مثلاً آپﷺ نے قبا میں کلثوم بن ہدم کے یہاں قیام فرمایا تھا اور سعد بن خیثمہ سے بڑی دیر تک آپﷺ ہم کلام تھے، ان دونوں شخصوں کا ذکر ان کے نسب کے ساتھ کیا ہے، اس سے علم الانساب میں ان کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ طرز و انداز سیرت کی اور کتابوں میں کم ملتا ہے، بعض واقعات کے ذکر میں تاریخی ترتیب کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے

جیسے مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع یا جائداد فدک کی بعد کے زمانوں میں کیا صورت حال رہی ۔ڈی خویہ نے لکھا ہے کہ اس کتاب سے ہمیں ایسے دقیق تاریخی حقائق سے واقفیت مل جاتی ہے جن پر کسی دوسری کتاب میں شاید ہی کوئی اطلاع ہو(۲۱)، اس نے ایک جرمن مورخ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بلاذری ان مورخوں میں سے ہے جو اپنے جمع کردہ مواد میں سے قابل ذکر روایتوں کی جانچ پڑتال کرنے میں سلامت روی کے لیے مشہور ہے یعنی وہ ہر روایت کو بیک نظر قبول کرنے کا عادی نہیں ہے بلکہ اس کو صحیح و غلط کی میزان پر قبول کرتا ہے(۲۲)،اس کے اسی منفرد اسلوب اور تحقیقی طرز نے کتاب سے استناد و استفادہ کی اہمیت محققین سیرت کے نزدیک بڑھادی ہے۔

بلاذری نے ضروری مواد زبانی روایات سے حاصل کیا ہے اور ہشام بن عروہ، واقدی، محمد بن سعد، علی بن محمد المدائنی، مصعب الزبیری، ہشام الکلبی وغیرہ جیسے ابتدائی سیرت نگاروں کی روایات کو اپنا ماخذ بنایا ہے، اسی خوبی کے سبب بعض محققین نے بلاذری کو اپنی سیرتی تحقیقات کے لیے ترجیح دی ہے، اس کی استنادی حیثیت اور اسلوب تحریر پر گفتگو کرتے ہوئے ایک محقق نے لکھا ہے:

> ''ایک تاریخی مصدر و ماخذ کی حیثیت سے بلاذری کے مرتبہ کے تعیین میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ ہمیشہ اصل متون اور حوالے پیش کرتا ہے جنہیں مصنفین مابعد نے طوالت اور حاشیہ آرائی کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کی تصنیفات کے ضروری حصوں اور بعد کی زیادہ تفصیلی تصانیف میں جو مطابقت و موافقت ہے اس کی بنا پر بڑی صحت سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ البلاذری کا اسلوب تحریر اختصار پسندانہ ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات وہ اختصار پسندی پر فنی تاثر بھی قربان کردیتا ہے اگرچہ اس کے یہاں طول طویل قصے بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے''۔(۲۳)

بلاذری کے سوانح اور اسلوب بیان پر اس مختصر گفتگو کے بعد فتوح البلدان میں مذکور سیرت کے موضوعات و واقعات پر نظر کرنا مناسب ہے، ہمارے پیش نظر فتوح البلدان کا وہ نسخہ ہے جس کو ایم جے ڈی خویہ نے ایڈٹ کر کے مطبع بریل لیڈن سے ۱۸۶۶ء میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا

تھا، مقدمہ میں اس نے بلاذری کے مختصر حالات، اسلوب تحقیق اور مواد کی فراہمی کے متعلق ابن ندیم کی کتاب الفہرست، تاریخ حلب، معجم الادباء اور المرزبانی وغیرہ سے معلومات نقل کیے ہیں جس سے بلاذری کے مورخانہ شعور کے علاوہ شعری وادبی ذوق اور تنقیدی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، فتوح البلدان کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کے متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے، P.K.Hitti اور F.C.Murgotten نے مشترکہ طور پر The Origins of the Islamic State کے نام سے ۱۹۲۴ء میں نیویارک سے، O. Rescher نے جرمن ترجمہ (۲۴) ۱۹۲۳ء میں لائپزک سے اور مولانا سید ابوالخیر مودودی نے اردو میں دارالطباعہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدر آباد دکن سے ۱۹۳۲ء میں (دو جلدوں میں) اس کی طباعت واشاعت کا اہتمام کیا، مقالہ میں بعض جگہ ترجمہ کے دوران اسی ترجمہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

پیش نظر کتاب اصلاً ۴۸۴ صفحات پر محیط ہے، ۶۲ صفحات پر قبائل، رواۃ وفقہاء اور مقامات کا اشاریہ ہے، آخر میں ایم جے ڈی خویہ کا جرمن زبان میں گراں قدر مقدمہ ہے جو ۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کا بنیادی موضوع تاریخ ومغازی ہے، ابتدائی حصہ یعنی تقریباً سو صفحات عہد نبویؐ کے بعض غزوات وواقعات سیرت پر مشتمل ہیں، ان میں بلاذری نے ایسی مشہور، متداول روایتیں جمع کی ہیں جن سے غزوات کے علاوہ آنحضورﷺ کی سیرت وسوانح کے اور گوشے بھی روشن ہوئے ہیں، ان سے عہد نبوی کے تمدنی، سیاسی اور بعض معاشرتی حالات کا علم ہوجاتا ہے، مثال کے طور پر آپﷺ قبا میں دوشنبہ، منگل، بدھ اور جمعرات ۴ روز قیام پذیر رہے (ص ۵)، مدینہ میں پہلا جمعہ آپﷺ نے مسجد بنی سالم میں ادا کیا (ص ۵)، مسجد نبوی کی تعمیر میں پتھروں کا اور ستونوں کے لیے درختوں کے تنوں اور چھت کے لیے کھجور کی شاخوں کا استعمال کیا گیا (ص ۶)، مسجد ضرار کا کیا واقعہ تھا (ص ۳)، مسجد نبوی کی تعمیر سے قبل آپﷺ نے پہلا جمعہ بنی سالم بن عوف صحابی کی مسجد میں ادا فرمایا (ص ۵)، خلفائے راشدین کے عہد سے خلیفہ مہدی کے زمانہ تک مسجد نبوی میں جو تعمیراتی تبدیلیاں ہوئیں اس کی تفصیلات مجملاً بیان کی ہیں (ص ۷)، حرم مدینہ کے متعلق آپﷺ کے کیا جذبات واحساسات تھے، مدینہ اور اس کے اطراف اور یمن وغیرہ کے

بعض سلاطین و امراء کے نام خطوط یا عمال کی روانگی اور عمال کی تقرری کے وقت آپ ﷺ کیا کیا ہدایتیں فرماتے تھے، بعض صحابہؓ کرام کو آپ ﷺ نے جاگیریں عطا فرمائیں، جیسے حضرت بلال بن حارث مزنیؓ کو ناحیۃ الفرع میں جاگیر کے طور پر ایک قطعہ عنایت فرمایا، بعد میں ان کی اولاد نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاتھ جب اس کو فروخت کیا تو اس میں ایک یا دو کانیں (معادن) نکل آئیں تو آل بلال نے کہا ہم نے تمہارے ہاتھ کاشت کی زمین بیچی ہے، کانیں نہیں بیچی ہیں اور اپنی تائید میں ایک فرمان رسول بھی پیش کیا جس کو دیکھتے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا اور حساب کتاب کر کے ان کے حوالہ کر دیا (ص ۱۳-۱۴)، یہ روایت سیرت کی کتابوں میں بہت کم ملتی ہے۔ اسی طرح بنو نضیر و قریظہ کے اموال اور خیبر و فدک کی جاگیروں کی تقسیم کے متعلق آپ ﷺ نے کیا طریقہ اپنایا تھا اور بعد کے زمانوں میں ان جائدادوں کے ساتھ صحابہؓ کرام کا کیا طرز عمل تھا، اس کا بھی حال معلوم ہوتا ہے (ص ۱۷، ۲۱، ۲۳، ۲۹ وغیرہ)، مختلف قبائل سے آنحضور ﷺ کے صلح ناموں، بعض عمال کی تقرری و معزولی، بعض افراد کا ارتداد، مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے دعوائے نبوت پر آپ ﷺ کا ردعمل، بغیر جنگ کے حاصل شدہ اموال کی تقسیم کا طریقہ کار، فتح مکہ، مفتوحہ علاقوں اور افراد سے جزیہ، بعثت نبوی کے وقت پڑھے لکھے صحابہ، ایلہ، مقنا، جربہ، دومۃ الجندل کے لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ، دربار نبوی ﷺ میں حاضر ہونے والے بعض کاتبین وحی و فرمان نبوی، آپ ﷺ کی مہر اور اس پر تحریر کردہ عبارت اور بعد کے ادوار میں اس مہر کا استعمال، زراعت و باغبانی کے لیے آپ ﷺ کی ہدایت جیسے آپ ﷺ نے وادی مہروز یا سیل مہروز کے متعلق فیصلہ فرمایا کہ پانی روک کر ٹخنوں ٹخنوں تک جمع کیا جائے پھر اوپر والا نیچے والوں کی طرف بہنے دے (ص ۱۰) یا نخلستان والوں کو عقبین (پاشنے) اور کھیتی والوں کو شراکین یعنی پشت قدم پر چپل یا جوتا کے تسمہ باندھنے کی جگہ تک پانی ملے اور پھر ان کے لیے چھوڑ دیا جائے جو ان سے نیچے ہیں (ص ۱۰)۔

مختصر یہ کہ ان صفحات سے صرف غزوات نبوی اور ابتدائی فتوحات اسلامیہ کی تفصیل ہی نہیں ملتی بلکہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں دیگر تمدنی، سیاسی اور تبلیغی سرگرمیوں کا بھی علم ہوتا ہے اور ان کا تعلق بہر حال سیرت مواد سیرت سے ہے۔

ہجرت نبوی: ہجرت مدینہ چونکہ اسلام کے طاقتور انقلاب کا نقطہ آغاز اور فتوحات اسلامیہ کا دیباچہ ہے، اس لیے اس کتاب کا آغاز بھی اسی واقعہ ہجرت سے کیا گیا ہے لیکن چونکہ سیرت کی دیگر کتابوں میں یہ تفصیلات موجود ہیں، اس لیے مصنف نے ان روایتوں کی تلخیص کو ترجیح دی ہے لیکن اس میں بھی وضاحت پیش نظر ہے جیسے قبا میں آپ ﷺ کے قیام کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت سعد بن خیثمہؓ کے یہاں قیام فرمایا، بلاذری کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے کلثوم بن ہدم بن امرء القیس بن الحارث بن زید بن عبید بن امیہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس کے یہاں قیام فرمایا اور چونکہ اس دن آپ ﷺ سعد بن خیثمہؓ سے محو گفتگو تھے اس سے بعض لوگوں نے سمجھا کہ آپ ﷺ نے ان کے گھر قیام فرمایا (ص ۲)۔ انساب الاشراف میں بھی بلاذری نے وضاحت کی کان یکثر اتیانہ للحدیث فظن قوم انہ نازل علیہ (۲۵)، آپ ﷺ ابن خیثمہ کے پاس گفتگو کی غرض سے زیادہ تشریف لاتے تھے اسی لیے لوگوں نے سمجھا کہ آپ ﷺ وہیں فروکش ہوئے ہیں۔

قبا میں آپ ﷺ کے قیام کی مدت: قیام قبا کی مدت میں اصحاب سیر اور محدثین میں اختلاف ہے، بلاذری کے مطابق رسول اللہ ﷺ قبا میں دوشنبہ، منگل، بدھ اور جمعرات کو قیام فرما کے جمعہ کے روز مدینہ کے لیے روانہ ہوئے (۲۶)، انساب الاشراف میں انہوں نے ۲۳ اور ۱۰ کی روایت بھی نقل کی ہے لیکن علامہ شبلیؒ نے امام بخاریؒ کی چودہ دن قیام کی روایت کو زیادہ قرین قیاس بتایا ہے (۲۷)، چونکہ بلاذری نے اس روایت کا سلسلہ سند بیان نہیں کیا ہے، اس لیے امام بخاریؒ کی روایت کو ترجیح دینا زیادہ صحیح اور مناسب ہے، بلاذری نے فتوح البلدان میں اور نہ ہی انساب الاشراف میں آپ ﷺ کی تاریخ روانگی بیان کی ہے، البتہ ان کے ہم عصر مورخ یعقوبی نے ۸/ ربیع الاول ۱۳ نبوی تحریر کیا ہے۔ (۲۸)

مدینہ میں پہلا جمعہ: بلاذری کے مطابق آپ ﷺ نے (مدینہ میں) جمعہ کی نماز بنی سالم بن عوف بن عمرو بن عوف بن خزرج کی مسجد میں ادا فرمائی اور یہ پہلی نماز جمعہ تھی جو اس مسجد میں ادا کی گئی (ص ۵)، ایک روایت ہے کہ مدینہ میں آپ ﷺ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے کاشانہ پر سات مہینے قیام فرمایا، اس دوران آپ ﷺ پر پوری نماز اتری (ایضاً)، انصار نے

اپنے تمام فاضل قطعے آپ ﷺ کو ہدیۃً پیش کیے اور عرض کیا کہ ہمارا جو مکان بھی آپ ﷺ پسند فرمائیں قبول فرمالیں (ص ۶)، جب تک مسجد نبوی تعمیر نہ ہوئی آپ ﷺ نے حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہؓ کی مسجد میں نماز ادا کی۔ (ص ۶)

مدینہ سے آپ ﷺ کی محبت: مدینہ کے متعلق بلاذری نے حضرت عائشہؓ سے مروی یہ حدیث نقل کی ہے جس سے اس خیر البلاد سے آپ ﷺ کی محبت اور تعلق کا علم اور دوسرے تمام شہروں سے اس کے امتیاز اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی کا ایک حرم ہوتا ہے میرا حرم مدینہ ہے، جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کو اپنا حرم بنایا ہے، اس لیے نہ اس کی گھاس کاٹی جائے نہ درخت، یہاں قتل کے لیے ہتھیار نہ اٹھائے جائیں جو ایسا کرے گا یا ایسا کرنے والوں کو پناہ دے گا، اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام بندگان خدا کی لعنت ہوگی، نہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور نہ اس کا دیا ہوا ہدیہ وتحفہ (ص ۸)، ایک دوسری روایت قبیلہ بنی حارث کی جھاڑی کی بابت ہے کہ جس نے اس میں ایک درخت کاٹا وہ اس کی جگہ دوسرا درخت لگائے اور دیت ادا کرے (ص ۹)۔ حضرت حسنؓ کی یہ روایت بھی ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ واہل مدینہ کے لیے دعا فرمائی اور اس کو طیبہ کے نام سے سب سے پہلے آپ ﷺ ہی نے موسوم کیا۔ دعا رسول اللہ ﷺ للمدینۃ و اھلھا وسماھا طیبۃ۔ (ص ۱۱)

اموال بنونضیر کی تقسیم کے سلسلہ میں ابن سعد سے اختلاف: قرآن مجید کی آیت مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْھُمْ الخ کے مطابق جو اموال مسلمانوں کی جنگی مہم کے بغیر یا بغیر لڑے بھڑے ہاتھ آجائیں تو وہ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حصہ ہیں، انہیں تقسیم نہیں کیا جائے گا، بلاذری کے مطابق یہ آیت اموال بنی نضیر کے متعلق ہے، آپ ﷺ نے اس کو مہاجرین میں تقسیم فرمایا اور جب سہل بن حنیف اور ابودجانہؓ کے فقر کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے انہیں بھی ایک ایک حصہ عطا فرمایا۔ انھا لرسول اللہ خالصۃً دون الناس فقسمھما رسول اللہ ﷺ فی المھاجرین الا ان سھل بن حنیف و ابا دجانۃ ذکرا فقراً فاعطاھما (ص ۱۸-۱۹) لیکن ابن سعد کے مطابق بنونضیر کے اموال رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھے جن سے آپ ﷺ ضروری اخراجات ادا فرماتے، اسی لیے آپ ﷺ نے اس مال کو پانچ حصوں میں نہ تقسیم فرمایا، نہ

اس میں سے کسی کا حصہ لگایا البتہ چند اصحاب کو عطا فرما کر ان کی تنگی دور فرمائی، اس کے بعد جن صحابہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائے ان کے نام نقل کیے ہیں۔ وکانت بنو النضیر صفیا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالصةً له حبسا لنوائبه ولم يخمسها ولم يسهم منها لاحد وقد اعطى ناسا من اصحابه و وسع في الناس منها فكان ممن اعطى ممن سمى لنا من المهاجرين (۲۹)۔

دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاذری مہاجرین وانصار میں اموال کی تقسیم کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ابن سعد کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اموال بنونضیر کو تقسیم نہیں فرمایا اور کسی کا حصہ نہیں لگایا، ہاں بعض صحابہ کرام کو اس میں سے کچھ عطا فرمایا۔ بلاذری نے اس کی توجیہ راوی کی زبان سے یہ پیش کی ہے کہ یہ ایک دوسری تقسیم ہے۔ هذا قسم اخر بين المسلمين على ما وصفه الله ۔ (ص ۱۹)

جنگ خیبر اور اس کے اموال کی تقسیم: عرب میں یہودیوں کا سب سے بڑا مرکز خیبر تھا، رسول اللہ نے جب بنونضیر کو جلاوطن کیا تو یہ لوگ خیبر جا کر آباد ہوئے اور وہیں انہوں نے اسلام کے خلاف عربوں کو برانگیختہ کرنا شروع کیا، بلاذری نے خیبر کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں، بلاذری کے بیان کے مطابق رسول اللہ خیبر ۷ھ میں غزوہ میں تشریف لے گئے، اہل خیبر عرصہ تک محصور رہے، آخر کار انہوں نے صلح کی درخواست کی ان کے خون معاف کر دیے جائیں، ان کے اہل وعیال قید نہ کیے جائیں، وہ اپنی جائداد وغیرہ چھوڑ کر چلے جائیں گے اور مسلمانوں سے کوئی چیز نہ چھپائیں گے، یہ بھی درخواست کی کہ چونکہ وہ فن زراعت وباغبانی سے واقف ہیں، اس لیے ان کو یہیں رہنے کا موقع دیا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست منظور فرمائی اور پھلوں اور غلوں کی بٹائی پر معاملہ طے ہوا (ص ۲۳)، ابن سعد نے بھی خیبر کی تفصیلات بیان کی ہیں لیکن بلاذری کی بعض ایسی روایتیں ہیں جو طبقات ابن سعد میں نہیں ہیں مثلاً مذکورہ بالا بنیادی باتوں کا ذکر ابن سعد میں نہیں ہے، اسی طرح خیبر کے حاصلات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات میں سے کس کو کتنا دیا، ابن سعد اس باب میں خاموش ہیں (۳۰)، جب کہ بلاذری نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے مال غنیمت میں ازواج مطہرات کو ۸۰ وسق کھجوریں اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر فرمایا۔ (ص ۲۴-۲۵)

وادی القریٰ پر قبضہ اور وادی تیما کے پہلے والی: خیبر کے بعد ۷ھ میں آپ ﷺ نے وادی القریٰ کا رخ کیا اور اس کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے انکار کیا اور جنگ پر آمادہ ہوگئے، رسول اللہ نے ان پر فتح پائی اور ان کے اموال کو اصولوں کے مطابق تقسیم فرمایا اور اہل خیبر کی طرح ان کے ساتھ بھی سلوک کیا (ص ۴۴)، اسی سے متصل آبادی اہل تیما کی تھی جب انہوں نے سنا کہ رسول اللہ نے وادی القریٰ کو فتح کرلیا ہے تو انہوں نے جزیہ پر صلح کی اور اپنی بستیوں میں بدستور مقیم رہے، ان کی زمینیں بھی ان کے قبضہ میں رہیں (ایضاً)، آپ ﷺ نے حضرت عمرو بن سعید بن العاص کو وادی القریٰ کا والی اور تیما کا والی یزید بن ابوسفیان کو مقرر کیا جو فتح تیما کے دن ایمان لائے تھے (ص ۴۴)، اسی باب میں ہشام کلبی سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ بنی عذرہ کے سردار حضرت حمزہؓ بن نعمان بن ہوذہ کو وہ جگہ جاگیر میں عطا فرمائی جہاں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا، یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ حضرت حمزہؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے قبیلہ کا صدقہ پیش کیا (ص ۳۵)، یہ روایت کتب سیرت میں کم ملتی ہے۔

فتح طائف سے متعلق روایات میں بلاذری و ابن سعد کے درمیان اختلاف: فتح طائف کے متعلق بلاذری کی روایت میں ان امور کی جانب نشان دہی کی جاتی ہے جو ابن سعد وغیرہ میں مفقود ہیں، بلاذری کے مطابق حنین کے دن قبیلہ ہوازن نے شکست کھائی اور درید الصمہ مارا گیا، شکست خوردہ افراد اوطاس کی طرف بھاگے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو عامر الاشعری کو ان کے تعاقب کے لیے روانہ فرمایا، وہ شہید ہوگئے، ان کے بعد ابوموسیٰ بن قیس الاشعری مسلمانوں کو لے کر اوطاس کی طرف بڑھے، ہوازن کے رئیس مالک بن عوف نے مسلمانوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر طائف کی راہ لی، اہل طائف سامان رسد کے ساتھ قلعہ بند ہونے کے لیے تیار ہوگئے، رسول اللہ ﷺ طائف پہنچے تو اہل ثقیف نے مسلمانوں پر تیروں اور پتھروں کی بارش کی اور گائے کی کھال کے دبابہ پر جو مسلمانوں کے ساتھ تھا گرم لوہے کی سلاخیں برسائیں جن سے دبابہ جل گیا اور اس کے نیچے جو مسلمان تھے زخمی ہوگئے، طائف کا محاصرہ پندرہ دنوں تک جاری رہا، یہ شوال ۸ھ کا واقعہ ہے۔ (ص ۵۵)

ابن سعد کا بیان ہے کہ حنین سے آپ ﷺ نے طائف کا قصد کیا اور حضرت خالد بن ولید کو آگے روانہ کیا (ص ۱۱۴)، بلاذری نے اس سے ذرا پہلے کی تفصیل مہیا کی کہ حنین کے دن قبیلہ

ہوازن کی شکست کے بعد شکست خوردہ افراد اوطاس کی طرف بھاگے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب کے لیے ابو عامر الاشعری کو روانہ کیا (ص ۳۴)، ابن سعد نے لکھا ہے کہ ثقیف نے اپنے لیے ایک سال تک کفایت کرنے والا سامان رسد اکٹھا کرلیا (۳۱)، بلاذری نے صرف اتنا لکھا کہ اہل طائف سامان رسد اکٹھا کرکے جنگ کے تیار ہوئے (ص ۵۵)، ابن سعد کے الفاظ ہیں کہ اہل طائف نے مسلمانوں پر ایسی تیر اندازی کی گویا وہ تیر نہیں ٹڈیوں کے پاؤں ہیں (۳۲)، بلاذری کے مطابق اہل ثقیف نے تیروں اور پتھروں کے علاوہ مسلمانوں کے دبابہ پر گرم لوہے کی سلاخیں برسائیں جن سے دبابہ جل گیا اور اس کے اندر موجود مسلمان زخمی ہوگئے (ص ۵۵)، اسی طرح ابن سعد کے بیان میں اٹھارہ دن (۳۳) کا محاصرہ ہے (۳۴) جب کہ بلاذری نے پندرہ دن لکھا ہے، استاد اور شاگرد کی نقل کردہ روایتوں میں باہم اختلاف سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلاذری کے قبول وعدم قبول کے اعتبار واستناد کا اپنا معیار تھا۔ اسی طرح فتح مکہ، تبالہ وجرش، تبوک، ایلہ، اذرح، مقنا، الجربا، دومۃ الجندل، صلح نجران، بعض وفود سے متعلق بعض اہم اور مستند روایات ہیں جن کی تفصیلات بخوف طوالت قلم انداز کی جاتی ہیں، بلاذری نے آپ ﷺ کے بعض صلح نامے، وثائق اور خطوط بھی نقل کیے ہیں، جن میں بعض کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اہل مقنا کے نام آپ ﷺ کا خط: امراوسلاطین کے نام آپ ﷺ کے خطوط ابن اسحاق، ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور طبری وغیرہ میں موجود ہیں، بلاذری نے بھی بنی جنبہ اور اہل مقنا کے نام رسول اللہ ﷺ کا خط نقل کرکے لکھا ہے کہ ایک مصری شخص نے اس کو املا کراتے وقت یہ بھی کہا تھا کہ اس نے آنحضور ﷺ کا وہ مکتوب گرامی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ سرخ جھلی پر تحریر تھا اور یہ تحریر بہت زیادہ واضح نہیں تھی، خط کا ترجمہ یہ ہے:

> "بسم اللہ الرحمن الرحیم - محمد رسول اللہ کی طرف سے بنی جنیبہ (۳۵) اور اہل مقنا کے نام۔
>
> تم پر سلامتی ہو مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے گاؤں واپس جارہے ہو، جب میرا یہ مکتوب تمہارے پاس پہنچے تو تم اپنے تئیں حفظ وامان میں سمجھو کیوں کہ اب تمہارے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے اور رسول اللہ نے تمہارے

گناہ اور وہ سب خون جن کے لیے تمہارا تعاقب کیا گیا تھا معاف کردیے ہیں
......آج کے بعد سے تم پر نہ کوئی ظلم ہوگا اور نہ زیادتی اور اللہ کا رسول تمہیں ان
چیزوں سے بچائے گا جن سے وہ خود اپنے آپ کو بچاتا ہے"۔ (ص ۶۰)

یہ خط کے صرف ابتدائی حصہ کا ترجمہ ہے، ابن سعد نے بھی اہل مقنا کے نام رسول اللہ ﷺ کا جو خط نقل کیا ہے بہ جز چند لفظی اختلاف کے اسی طرح ہے البتہ بلاذری نے آخر میں " کتب علی ابن ابو طالب فی سنہ ۹ ھجری (ص ۶۰) بھی تحریر کیا ہے جو ابن سعد کے یہاں نہیں ہے۔ (۳۶)

اس خط کے سلسلہ میں ڈی خویہ نے محمد بن عساکر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ خط جعلی ہے، اس کا ایک ثبوت صریح نحوی غلطی "علی بن ابو طالب" کی ہے، یہ علی بن ابی طالب ہونا چاہیے جب کہ معلوم ہے کہ حضرت علیؓ نحو کے امام تھے اور ان کے قلم سے ایسی غلطی ہرگز نہیں ہوسکتی، دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ غزوہ تبوک میں شریک نہیں ہوئے۔ (حاشیہ ص ۶۰-۶۱)

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ابن عساکر نے بلاذری کے استاد ابن سعد کے ذریعہ نقل کیے گئے خط کو جعلی نہیں قرار دیا ہے لیکن بلاذری کے ذریعہ نقل کیے گئے اسی خط کو جعلی بتایا۔ اس کے علاوہ بلاذری نے اکیدر کے نام (ص ۶۱)، اہل نجران کے نام (ص ۶۵)، اہل یمن کے نام (ص ۶۹)، زرعہ بن ذی یزن کے نام (ص ۷۰)، ملوک حمیر کے نام (ص ۷۱)، معاذ ابن جبل کے توسط سے یمن کے نام (ایضاً)، حضرت ابوزید انصاری اور عمرو بن العاص کے ذریعہ عمان کے نام خطوط (ص ۷۶) نقل کیے ہیں۔ اسی طرح مسیلمہ کذاب سے خط و کتابت کا ذکر ص ۸۷ پر ہے۔

تمام قدیم سیرت نگاروں کے ساتھ بلاذری کے نقل کردہ خطوط کی اہمیت کے پیش نظر اردو سیرت نگاروں نے بھی ان کو نقل کیا ہے۔

عہد نبوی ﷺ میں خواندہ صحابہؓ کی تعداد: خواندہ صحابہ کرام کی تعداد فتوح البلدان کے مطابق ۱۷ ہے (۳۷)، بلاذری نے ولید بن صالح اور اپنے استاد ابن سعد کے سلسلہ سند سے روایت کرتے ہوئے ان حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل بیان کیے ہیں۔ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت ابوعبیدہ، حضرت طلحہ، یزید بن ابی سفیان، ابوحذیفہ بن عتبہ، حاطب بن عمر، ابوسلمہ بن عبد الاسد، ابان بن سعید، خالد بن سعید، عبداللہ بن سعد، حویطب بن عبدالعزیٰ، ابوسفیان بن حرب،

معاویہ بن ابی سفیان، جہم بن صلت، علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہم اجمعین (ص ۴۷۱-۴۷۲)۔ ان کے علاوہ ایک روایت کے مطابق شفا بنت عبداللہ العدویہ بھی لکھنا جانتی تھی اور اس نے حضرت حفصہؓ کو لکھنا سکھایا تھا (ص ۴۷۲)۔ ابی بن کعب نے کتابت وحی کا فریضہ سب سے پہلے انجام دیا (ص ۴۷۳)، حضرت زید بن ثابت انصاریؓ بھی یہ فریضہ انجام دیتے تھے (۴۷۴)، قبیلہ بنی تمیم کے حنظلہؓ بھی لکھنا جانتے تھے اور کتابت وحی کا ایک بار شرف ان کو بھی حاصل ہوا (۴۷۳)، بلاذری نے واقدی کے حوالہ سے درج ذیل اور اشخاص کے اسمائے گرامی بھی درج کیے ہیں۔ سعد بن عبادہ، رافع بن ملک، اسید بن حضیرہ، معن بن عدی، بشیر بن سعد، منذر بن عمرو، سعد بن ربیع، اوس بن خولی رضی اللہ عنہم، عبداللہ بن ابی (منافق) کا بھی ذکر ہے (ص ۴۷۴)۔

مہر نبوت: بلاذری نے آنحضورؐ کی مہر کے متعلق حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب آنحضورؐ نے روم کے بادشاہ کو نامہ تبلیغ بھیجنا چاہا تو لوگوں نے عرض کیا کہ وہاں جس مکتوب پر مہر لگی ہو اسی کو پڑھتے ہیں تو رسول اللہؐ نے چاندی کی مہر بنوائی، اس پر "محمد رسول اللہ" نقش کیا گیا (۳۸)، وہ مہر میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے (ص ۴۶۱) دوسری روایت کے مطابق خاتم نبوی خالص چاندی کی تھی اور اس کا نگینہ بھی چاندی کا تھا (ایضاً)، اس کا رنگ حبشی پتھر جیسا تھا (ص ۴۶۲)، آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو الفاظ میں نے مہر پر لکھوائے ہیں وہ کوئی دوسرا نہ لکھوائے (ص ۴۶۲)، ابن سعد نے بھی اس روایت کو حضرت انسؓ بن مالک کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ (۳۹)

ناپ تول کا طریقہ: اسی طرح بلاذری نے نقود یعنی سکوں کے وزن کے متعلق ابن سعد کے واسطے سے روایت نقل کی ہے کہ اہل مکہ کے پاس ہرقل کے دینار بھی آتے تھے اور ایرانیوں کے دراہم بغلیہ بھی۔ وہ ان سکوں کو تول کر خرید و فروخت کرتے تھے، عربوں میں مثقال کا ایک معین وزن تھا جو قریب ۲۲ قیراط کا تھا اور دس درہموں کا وزن سات مثقال تھا، ایک رطل ۱۲ اوقیہ اور ایک اوقیہ ۴۰ درہم کا ہوتا، رسول اللہ نے ان اوزان کو باقی رکھا (ص ۴۶۶)۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ بلاذری کی کتاب جہاں مغازی و فتوحات اسلامیہ کی مختصر اور جامع تاریخ ہے وہیں اپنی مستند روایتوں اور عہد نبوی کے بعض اہم واقعات کے اعتبار سے جو

سیرت کی عام کتابوں میں نہیں ملتے، سیرت نگاروں کے نزدیک معتبر ماخذ ہے، البتہ آنحضورﷺ کی حیات طیبہ کے بعض واقعات مثلاً آپﷺ کی پیدائش، اخلاق و عادات، سواریوں اور نعلین مبارک وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔

حوالہ جات

(۱) کتاب الفہرست، ابن ندیم، ص ۱۶۴، مطبعہ رحمانیہ، مصر۔ (۲) معجم الادباء، ج ۲، ص ۱۲۸، مطبعہ ہندیہ بالموسکی مصر۔ (۳) الاعلام، ج ۱، ص ۸۵-۸۶، مطبعہ عربیہ مصر، ۱۹۲۷ء۔ (۴) فتوح البلدان (اردو ترجمہ)، ج ۱، ص ۲، دار الطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۲ء۔ (۵) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۴، ص ۲۳۷، طبع اول دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔ (۶) نقوش "رسول نمبر" ج ۱، ش ۱۳۰، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۱۵۷، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔ (۷) فتوح البلدان (اردو ترجمۃ المصنف)، ج ۱، ص ۳۔ (۸) معجم الادباء، ج ۲، ص ۱۲۷۔ (۹) فتوح البلدان (ترجمۃ المصنف) ص ۷۔ (۱۰) ایضاً۔ (۱۱) ایضاً ص ۲ و اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۴، ص ۲۳۷۔ (۱۲) کتاب الفہرست، ص ۱۶۴، معجم الادباء، ج ۲، ص ۱۲۷، اعلام، ج ۱، ص ۸۶۔ (۱۳) انساب الاشراف (مقدمۃ المحقق) ص ۷، دار المعارف مصر، تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس۔ (۱۴) فتوح البلدان (ترجمۃ المصنف) ص ۱۔ (۱۵) یعنی آغاز شعور ہی سے۔ (۱۶) کتاب الفہرست، ص ۱۶۴۔ (۱۷) فتوح البلدان (ترجمۃ المصنف) ص ۳، الاعلام، ج ۱، ص ۸۶۔ (۱۸) فتوح البلدان (عربی)، ص ۲، مطبوعہ بریل لیڈن، ۱۸۶۶ء۔ (۱۹) طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۱۵۷، جزء اول، قسم اول، مطبوعہ بریل لیڈن ۱۳۲۲ھ۔ (۲۰) فتوح البلدان (عربی)، ص ۲۔ (۲۱) فتوح البلدان (ترجمۃ المصنف)، ص ۸۔ (۲۲) ایضاً، ص ۷-۸۔ (۲۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۴، ص ۲۳۵۔ (۲۴) ایضاً، ص ۲۳۷۔ (۲۵) انساب الاشراف، ص ۲۶۳۔ (۲۶) فتوح البلدان، ص ۵، انساب الاشراف، ص ۲۶۳۔ (۲۷) سیرۃ النبیؐ، حصہ اول، ص ۱۹۷، طبع جدید، ۲۰۰۳ء۔ (۲۸) تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۴۱۔ (۲۹) طبقات ابن سعد، قسم اول، جزء ثانی، ص ۴۱۔ (۳۰) ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ذکر غزوۂ خیبر، ص ۸۲ و مابعد۔ (۳۱) ایضاً قسم اول، جزء ثانی، ص ۱۱۴۔ (۳۲) ایضاً۔ (۳۳) سیرۃ النبیؐ، ج ۱، ص ۳۸۶۔ (۳۴) ابن سعد حوالہ مذکور، ص ۱۱۴۔ (۳۵) یہ ابن سعد کے مطابق بنی جنبہ ہے، جزء اول، قسم ثانی، ص ۲۸۔ (۳۶) یہ پورا خط ابن سعد حوالہ مذکور ص ۲۸ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ (۳۷) سیرۃ النبیؐ، ج ۱، طبع جدید، ۲۰۰۳، ص ۱۰۔ (۳۸) مہر پر پہلے اللہ پھر رسول اور اس کے نیچے محمد لکھوایا۔ (۳۹) ابن سعد، جزء اول، قسم ثانی، ص ۱۶۴۔

پھیل چکی تھی۔ چنانچہ اکبر نے اسے ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا۔ یہ اکبر کی تخت نشینی کے ۳۳ویں سال (۹۹۷ھ/۱۵۸۸) کا واقعہ ہے۔ فیضی اس اعزاز سے مشرف ہونے والا دوسرا شاعر تھا۔ اس سے پہلے یہ خطاب غزالی مشہدی کو دیا گیا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ خطاب پانے سے دو تین روز پہلے فیضی نے ایک قصیدہ کہا تھا، اس کے اشعار سے صاف پتا چلتا ہے کہ فیضی نے اس لمحۂ سعید کی آہٹ کو محسوس کرلیا تھا جو اس کے لیے "ملک الکلام" کا مژدۂ جانفزا لے کر آنے والا تھا۔

آں روز کہ فیض عام کردند ما را ملک الکلام کردند
ما را بہ تمام در ربودند تاکار سخن تمام کردند
از بہر صعود فکرت ما آرائش ہفت بام کردند(۲۷)

اکبر نے فیضی کو شہزادوں کی اتالیقی کا منصب بھی سپرد کیا چنانچہ سلیم، مراد، دانیال سب اس کے شاگرد تھے۔ فیضی حکیم تھا، شاعر تھا، بقول والہ داغستانی وہ کمالات صوری و معنوی کا جامع اور سخنوری میں مسلم زماں تھا۔ اس کو شاہی قربت اور اقتدار حاصل تھا حالانکہ اس نے کسی منصب یا حکومت کی ہوس نہ کی۔ ملک سخن کی حکمرانی خدا سے لایا تھا، اسی پر وہ قانع رہا۔ وہ صرف علمی و ادبی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا، شاہی عہدوں کا طالب نہیں تھا پھر بھی وہ اس سے بچ نہ سکا۔ چنانچہ ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ میں اکبر نے شیخ عبدالنبی کا زور توڑ کر صدارت کے دو ٹکڑے کیے تو آگرہ کالنجر اور کالپی کی صدارت فیضی کو دی گئی (۲۸)۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ میں اکبر نے معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور تجارتی اصلاح کی غرض سے ایک مشاورتی مجلس تشکیل دی تو فیضی کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ ۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ میں نظام سلطنت پر نظر ثانی کے موقع پر اکبر نے شہزادہ سلیم کی سربراہی میں "بزم کدخدائی و ولادت" بنائی تو فیضی کو اس کا معاون مقرر کیا گیا۔ ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ میں اکبر نے یوسف زئی پٹھانوں کے خلاف فوجیں بھیجیں تو فیضی کو بھی اس مہم پر روانہ کیا۔ (۲۹)

۹۹۹ھ/۱۵۹۰ میں اکبر نے فیضی کو دو اہم سفارتوں پر بھیجا۔ ایک خاندیش کے فرماں روا راجی علی خاں کے پاس دوسرے احمد نگر کے برہان نظام شاہ کے پاس۔ فیضی ایک سال آٹھ مہینے کی مدت میں ان دونوں سفارتوں کے معاملات بہ حسن و خوبی انجام دے کر ۱۰۰۱/۱۵۹۲ میں واپس ہوا۔ فیضی اس سفر میں دو عظیم شاعروں۔ ملک قمی (م ۱۶۱۶) اور ظہوری (م ۱۶۱۶) سے بھی ملا۔

شاعری، فلسفہ، ریاضی، الجبراء اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو فارسی میں منتقل کرنے کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ گویا دارالخلافہ میں ایک طرح کی اکادمی قائم ہوگئی جس میں ملک کے برگزیدہ اہل قلم تصنیف وتالیف میں مشغول تھے۔(۱)

عہد اکبری کے علماء وفضلاء کی فہرست بہت طویل ہے۔ان میں چند نمایاں نام حسب ذیل ہیں: ملا عبداللہ سلطان پوری (م ۱۵۸۲)، شیخ عبدالنبی (م ۱۵۸۳)، شیخ مبارک ناگوری (۱۵۰۵-۱۵۹۲)، شیخ ابوالفضل (۱۵۵۱-۱۶۰۲)، ملا عبدالقادر بدایونی (۱۵۴۰-۱۵۹۵)، عبدالرحیم خان خاناں (۱۵۵۱-۱۶۲۷)، میر فتح اللہ شیرازی (م ۱۵۸۹)، حکیم ابوالفتح گیلانی (م ۱۵۸۹)، میر عبداللطیف قزوینی (م ۱۵۷۳)، حاجی سلطان تھانیسری (شہادت ۱۵۹۹)، حاجی ابراہیم سرہندی (م ۱۵۸۶)، نظام الدین احمد (م ۱۵۹۴)، ملا عبدالباقی نہاوندی (م ۱۶۳۲)، قاضی جلال الدین ملتانی (م ۹۱-۱۵۹۰)، مرزا غیاث الدین علی المخاطب بہ نقیب خاں (م ۱۰۲۳ھ)، مولانا یعقوب صرفی کشمیری (۱۵۰۲-۱۵۹۵)، خواجہ حسام الدین (۱۵۶۹-۱۶۳۳) سلوک وطریقت کے آفتاب وماہتاب شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴-۱۶۲۴) اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۵۱-۱۶۴۲) کا تعلق بھی اسی دور سے تھا۔

اکبر کا عہد حکومت فارسی ادب وانشاء کا عہد زریں تھا۔اکبر شعرا کی پذیرائی وقدردانی میں کس قدر دریادل واقع ہوا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ہندو شعراء و ماہرین فن کو بھی "میاں، مرزا" اور "خان" کا خطاب دیا کرتا تھا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو(۲)۔ ابوالفضل نے اکبر کی سرپرستی سے فیض یاب ہونے والے ۵۹ شاعروں کا ذکر کیا ہے(۳)۔ملا عبدالقادر بدایونی نے ۱۶۸ شعراء کے تراجم قلم بند کیے ہیں جو دربار اکبری سے وابستہ تھے یا سلطنت کے مختلف حصوں میں آباد ونغمہ بار تھے۔ملا عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی (سال تکمیل ۱۶۱۶) میں ۱۰۵ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔خواجہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری (سال تکمیل ۱۵۹۳) میں ۸۱ شاعروں کے حالات لکھے ہیں۔(۴)

اکبر پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے ملک الشعراء کے منصب کا آغاز کیا اور درباری مورخ کا عہدہ قائم کیا۔غزالی مشہدی (۱۵۲۷-۱۵۷۲) ہندوستان کے تیموری بادشاہوں کے دربار کا

پہلا ملک الشعراء تھا جو جون ۱۵۶۷ میں اکبر کے دربار میں باریاب ہونے کے کچھ ہی دنوں کے بعد اس منصب سے سرفراز ہوا (۵)۔ غزالی مشہدی کے علاوہ عہد اکبری کی شعری کہکشاں کے چند تابندہ ستارے حسب ذیل ہیں:

عرفی شیرازی (۱۵۵۵-۱۵۹۱)، نظیری نیشاپوری (م ۱۶۱۲)، خواجہ حسین ثنائی (م ۱۵۸۶)، مرزا محمد قلی میلی (م ۱۵۷۵)، مولانا قاسم کاہی (م ۱۵۸۰)، محمد رضا شکیبی اصفہانی (۱۵۵۶-۱۶۱۳)، قاسم ارسلان (م ۱۵۹۵)، حیاتی گیلانی (م ۱۶۰۶)، مرزا منوہر توسنی (م ۱۶۱۶)، جعفر قزوینی (م ۱۶۱۲)، قلیج خاں الفتی (م ۱۶۱۴) میر محمد معصوم نامی (م ۱۶۰۶)، اسد بیگ قزوینی (م ۱۶۳۱) خواجہ حسین مروی (م ۹۷۹ھ)، میر حیدر معمائی رفیعی (م ۱۰۳۲ھ)، رہی قلندری، بابا طالب اصفہانی، میر اشکی قمی، تشبیہی کاشی۔

یوں تو اکبر کا دربار علماء و فضلاء سے معمور تھا لیکن علماء میں دو شخص غیر معمولی اثر و اقتدار کے حامل تھے۔ ایک ملا عبداللہ سلطان پوری دوسرے شیخ عبدالنبی۔ ان دونوں حضرات کے علاوہ ابوالفضل اور فیضی کے والد شیخ مبارک ناگوری کی شخصیت بھی خاصی نمایاں تھی۔ ملا عبداللہ سلطان پوری مخدوم الملک تھے اور شیخ عبدالنبی کو اکبر نے ۱۵۶۴ میں صدر الصدور مقرر کیا تھا۔ شیخ عبدالنبی مشہور وحدت الوجودی صوفی حضرت عبدالقدوس گنگوہی (۱۴۵۵-۱۵۳۸) کے پوتے تھے۔ دربار اکبری کے مورخوں اور انشاء پردازوں میں ملا عبدالقادر بدایونی اور شیخ مبارک ناگوری کے بیٹے شیخ ابوالفضل علامی بے حد ممتاز تھے۔ ابوالفضل حکومت کے معاملات میں غیر معمولی اثر و رسوخ رکھتا تھا بلکہ بقول والہ داغستانی اکبر کا وزیر اعظم تھا۔ (برادر فیضی شیخ ابوالفضل بہ منصب وزارت اعظم اکبر پادشاہ سرافراز بود)۔ (۶)

یہ قدرے طویل مگر ضروری تمہید اس لیے پیش کی گئی تا کہ آیندہ صفحات میں فیضی کی شخصیت، اس کے شعر و فن اور مذہب کے بارے میں سمجھنا آسان ہوجائے۔ شیخ ابوالفیض فیضی (۱۵۴۷-۱۵۹۵) عہد اکبری کے سربرآوردہ عالم شیخ مبارک ناگوری (۱۵۰۵-۱۵۹۳) کا بیٹا اور شیخ ابوالفضل علامی (۱۵۵۱-۱۶۰۲) کا بڑا بھائی تھا۔ شیخ مبارک ایک عربی النسل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری کے خاتمے میں لکھا ہے کہ ان کا خاندان یمن کا رہنے والا

تھا۔ خاندان کے ایک بزرگ شیخ موسیٰ جو پانچویں پشت میں ہیں، نویں صدی ہجری میں یمن سے ترک وطن کر کے سندھ کے علاقہ سیوستان میں واقع قصبہ ریل میں سکونت پذیر ہو گئے تھے (۷)۔ فیضی کے دادا شیخ خضر یہیں پیدا ہوئے (۸)۔ دسویں صدی ہجری میں شیخ خضر نقل مکانی کر کے ناگور (نزد اجمیر) چلے آئے۔ شیخ مبارک ۹۱۱ھ/۶-۱۵۰۵ میں یہیں پیدا ہوئے۔ ان کا نام مبارک اللہ رکھا گیا لیکن شیخ مبارک کے نام سے مشہور ہوئے۔ شیخ ان کا خاندانی لقب تھا (۹)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناگور میں فیضی کے دادا شیخ خضر کا جس خاندان سے رشتہ ازدواج ہوا تھا اس کا تعلق چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ قاضی حمید الدین ناگوری (م ۱۲۷۴) سے تھا کیونکہ ریاض الشعراء (سال تکمیل ۱۷۴۹) کے مولف علی قلی والہ داغستانی (۱۷۱۲-۱۷۵۷) نے لکھا ہے کہ فیضی قاضی حمید الدین ناگوری کی اولاد سے تھا جو خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی (م ۱۲۳۵) کے استاد تھے (فیضی از اولاد قاضی حمید الدین ناگوری ست کہ استاد خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی بودہ)۔ (۱۰)

یہاں ضمناً یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ جس زمانے میں شیخ خضر ناگور میں آ بسے تھے اس وقت ناگور سلوک و طریقت کا ایک اہم مرکز تھا جس کی فضا ممتاز علماء و صوفیہ کے انفاس قدسیہ سے معطر اور جاں نواز تھی۔ اس فضا میں دیگر دیار و امصار کے اصحاب علم و طریقت ناگور میں کھنچے چلے آ رہے تھے۔ فیضی کے دادا شیخ خضر بھی انہیں برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک تھے۔ سید اطہر عباس رضوی نے اس امر کی جانب واضح طور پر اشارہ کیا ہے۔

> Nagaur was a sufi centre. It attracted other sufis and it was this galady of saints and scholars that prompted Sheikh Khizr, the father of Sheikh Mubarak and the grandfather of Sheikh Abul Fazl, to settle there. (11)

شیخ مبارک نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ایک ترک نژاد بزرگ شیخ عطن سے حاصل کی (۱۲)۔ محمد حسین آزاد اور مالک رام دونوں نے لکھا ہے کہ شیخ مبارک ناگور میں خواجہ عبید اللہ احرار کے درس میں شامل رہے اور بہت سے معنوی فیض حاصل کیے۔ (۱۳) یہ بیان تاریخی لحاظ سے

محل نظر ہے۔ خواجہ ناصر الدین عبیداللہ احرار خواجہ بہاء الدین نقشبند (۱۳۱۸-۱۳۸۹) کے خلیفہ حضرت یعقوب چرخی (م ۱۴۳۴) کے مرید تھے۔ خواجہ عبیداللہ احرار اپریل ۱۴۰۴ کو شاش (نزد تاشقند) میں پیدا ہوئے اور ۲۰ رفروری ۱۴۹۰ کو سمرقند میں انتقال کیا۔ خود آزاد نے دربار اکبری میں لکھا ہے کہ خواجہ عبیداللہ احرار کا انتقال ۲۰ رفروری ۱۴۹۰ کو ہوا۔ اطہر عباس رضوی نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے (۱۴)، شیخ مبارک ناگوری کی ولادت کی تاریخ ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ ہے۔ اس لحاظ سے وہ خواجہ عبیداللہ احرار کی وفات کے تقریباً پندرہ سال بعد پیدا ہوئے۔ (۱۵)

ناگور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد شیخ مبارک گجرات چلے گئے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، ناگور اصحاب سلوک و طریقت کے لیے مشہور رہا ہے لیکن ردولی اور اجمیر کی طرح اس وقت اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ حکومت کی بد نظمی کی وجہ سے وہاں کفار کا غلبہ بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ ایک بزرگ شیخ کبیر نے بھی ناگور سے نقل مکانی کر کے گجرات میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ عجب نہیں کہ شیخ مبارک بھی اسی کشمکش میں ناگور سے گجرات چلے گئے ہوں۔ (۱۶) گجرات پہنچ کر شیخ مبارک محقق دوّانی (۱۴۲۷-۱۵۰۱) کے شاگرد ابوالفضل گازرونی خطیب سے وابستہ ہوگئے۔ وہاں انہوں نے مولانا عماد لاری کے علاوہ دیگر علماء و صوفیہ سے بھی استفادہ کیا۔ (۱۷) محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ گجرات میں شیخ مبارک ناگوری کی ملاقات مست آگاہ دل ولی کامل شیخ یوسف مجذوب سے ہوئی۔ انہیں کے حکم پر شیخ مبارک گجرات سے آگرہ گئے، آزاد کا یہ بیان محل نظر ہے کیونکہ شیخ یوسف مجذوب کا تعلق لاہور سے تھا۔ گجرات میں ان کی آمد یا قیام کا ذکر نہیں ملتا۔ (۱۸)

بہر کیف شیخ مبارک ۶ رمحرم ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء کو گجرات سے آگرہ آگئے (۱۹)، آگرہ میں ان کی ملاقات مشہور مجذوب شیخ علاء الدین (م ۴۱-۱۵۴۰) سے ہوئی جو شیخ علاول بلاول کے نام سے معروف ہیں۔ شیخ علاول بلاول نے شیخ مبارک کو آگرہ میں ہی رہنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا انہوں نے چار باغ میں اقامت اختیار کر لی اور وہیں شادی کر لی (۲۰)۔ شیخ علاول بلاول نے شیخ مبارک کو لائق اور جید الاستعداد فرزندوں کی ولادت کی بشارت بھی دی تھی اور یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ ابتداء میں ان کو مخالفین کی سازشوں کے باعث ہزیمت اٹھانی پڑے گی لیکن بالآخر کامیابی انہیں کو حاصل ہوگی۔ (۲۱)

شیخ ابوالفیض فیضی ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بعض تاریخ نویسوں نے ”دکنی“ کی نسبت کے ساتھ فیضی دکنی لکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ فیضی کے ساتھ یہ نسبت لگانے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ فیضی نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم اپنے والد شیخ مبارک سے حاصل کی۔ اپنے دیوان کے آغاز میں اس نے اپنے والد سے تعلیم و تربیت کا اعتراف کیا ہے لیکن ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ فیضی خواجہ حسین مروی (م ۹۷۹ھ) کا تربیت یافتہ تھا جن کو علامہ ابن حجر مکی (م ۱۵۶۷) کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل تھا (۲۲)۔ فیضی نے مختصر عمر پائی، وہ زندگی کی صرف ۴۸ بہاریں دیکھ سکا، اواخر عمر میں وہ ضیق النفس کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بیماری کے دوران وہ اکثر یہ شعر پڑھتا رہتا تھا جس میں مشیئت ایزدی کے آگے انسان کی بے بسی اور بے چارگی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ قدرت خداوندی کی شان کا اعلان بھی ہے ۔

گر ہمہ عالم بہم آیند تنگ
بہ نشود پاے یکے مور لنگ

(اگر ساری دنیا اکٹھی ہو جائے اور کوشش کرے تب بھی اس کی کوششوں سے ایک لنگڑی چیونٹی کی ٹانگ بھی ٹھیک نہ ہوگی)۔

”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“ کے مصداق فیضی کی بیماری شدید سے شدید تر ہوتی گئی اور بالآخر اس نے ۱۰ رصفر ۱۰۰۴ھ/۱۵ راکتوبر ۱۵۹۵ء کو آگرہ میں انتقال کیا۔

فیضی کو آگرہ میں شیخ مبارک، شیخ علاول بلاول مجذوب اور میر رفیع الدین صفوی (۸۸۱ھ-۹۵۴ھ) کے پاس دفن کیا گیا (۲۳)۔ فیضی کی زندگی کا ابتدائی دور بڑی صعوبتوں میں گزرا۔ اکبر کا دور مذہبی فتنہ وشر کا دور تھا۔

شیخ مبارک ناگوری اور ان کے دونوں بیٹے فیضی اور ابوالفضل چونکہ غیر معمولی علم وفضل اور ذہانت کے مالک تھے اس لیے دربار اکبری سے وابستہ ”فقہائے مکر و حیل و علمائے دجل و فساد“ کے دلوں میں یہ لوگ کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری شیخ مبارک اور ان کے خاندان کے استیصال کے لیے کمر بستہ تھے۔ یہ حضرات شیخ مبارک اور ان کے بیٹوں پر طرح طرح کے الزامات لگاتے رہتے تھے۔ کبھی ان کو رافضی کہتے تو کبھی بدعتی اور مہدوی ہونے کے اتہامات عائد کرتے تھے۔ (۲۴)

ابوالفضل نے آئین اکبری میں شیخ عبدالنبی کو ''سرآمد فتنہ جویاں'' لکھا ہے۔ اس فتنہ جو کو اکبر نے صدرالصدور مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ عسرت و تنگ دستی کے زمانے میں ایک بار فیضی اپنے والد کے ساتھ شیخ عبدالنبی کے پاس جا کر معاشی مدد کا طلب گار ہوا تو اس نے ان کی مدد تو بالکل نہ کی بلکہ دونوں پر شیعیت کا الزام لگا کر مجلس سے نکلوا دیا۔ (۲۴)

اس کے بعد فیضی اپنے والد اور اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں ابوالفضل اور ابوالخیر کے ساتھ دنیادار مولویوں کی گرفت سے بچنے کے لیے جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتا رہا، بالآخر ہوا کا رخ بدلا اور شرعی احتساب کے نام پر جبر و استبداد کا طوفان برپا کرنے والوں کے اصلی چہرے سامنے آئے۔ جب فضا سازگار ہوئی تو فیضی خان اعظم مرزا عزیز کوکہ (م ۲۴-۱۶۲۳) کی سفارش پر اپنے والد کے ساتھ اکبر کے دربار میں باریاب ہوا۔ یہ ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ کا واقعہ ہے (۲۵)۔ دربار اکبری میں پہلی باریابی کے موقع پر فیضی نے جو قصیدہ پڑھا تھا اس میں قریب دو سو شعر ہیں بقول محمد حسین آزاد فیضی نے یہ قصیدہ راستے میں کہا تھا اس لیے اس میں اپنی گھبراہٹ، پریشانی اور بے قراری کی حالتیں عجیب عجیب رنگ سے دکھائی ہیں اور اب موقع پایا ہے تو دشمنوں کے منھ میں بھی تھوڑی تھوڑی خاک بھر دی۔ اس قصیدے کے مرقوم الذیل دو شعروں میں صدرالصدور اور مخدوم الملک اور دربار اکبری کے دوسرے علماء کے قول و فعل کے تضاد کی نقش گری کے ساتھ ساتھ اس مذاق و تمسخر کو بھی اجاگر کر دیا گیا ہے جو یہ صاحبان جبہ و دستار، دین و شریعت کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ کیسی عبرت ناک حالت تھی ان ہوا پرست علماء کی کہ عجب وریا کی مسند پر بیٹھ کر زبان درازیاں کرتے تھے۔ یہ لوگ مدعی تو ایمان کے تھے لیکن ان کے کردار و عمل میں کذب و انکار کا رنگ نمایاں تھا اور شہادت دے رہا تھا کہ یہ اندر سے کھوکھلے ہیں، ان کے قول و فعل کا حقیقت اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

زباں کشیدہ بدار القضائے عجب وریا　　　شہود کذب ز دعوی گران ایمانی
اگر حقیقت اسلام در جہاں این ست　　　ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی (۲۶)

فیضی علم و فضل اور ذہانت و فطانت کا پیکر تھا۔ اس نے جلد ہی اکبر کے دربار میں غیر معمولی تقرب و احترام حاصل کر لیا۔ اب وہ اکبر کو اس قدر عزیز تھا کہ ایک پل کی جدائی بھی اس کو گوارا نہ تھی۔ اکبر سفر حضر میں ہر وقت اس کو ساتھ رکھتا تھا۔ شاعری کی حیثیت سے فیضی کی شہرت چاروں طرف

ملک الشعراء فیضی، ایک تجزیاتی مطالعہ

جناب حنیف نجمی*

مغل بادشاہ ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر (۱۵۴۲-۱۶۰۵) جہاں ایک طرف اپنی مسلسل فتوحات، کامیاب مدبرانہ نظم ونسق، رواداری اور مشرب صلح کل کے لحاظ سے تاریخ ہند میں ایک جداگانہ شناخت رکھتا ہے وہیں دوسری طرف وہ اس اعتبار سے بھی دیگر شاہان تیموریہ سے منفرد و ممتاز ہے کہ اس نے اپنے دور حکومت (۱۵۵۶-۱۶۰۵) میں مختلف علوم وفنون کی وسیع پیمانے پر سرپرستی کی اور شعر وادب وفن کے فروغ ونشو ونما کے باب میں فیاضیوں اور زرپاشیوں کی ایسی روایت قائم کی جس کی مثال دیگر سلاطین ہند کے یہاں ملنا مشکل ہے۔ اکبر خود پڑھا لکھا نہ تھا لیکن علما وفضلا اور ارباب فن کی پذیرائی وقدر شناسی میں نہایت پرجوش تھا۔ ناخواندہ ہوتے ہوئے بھی وہ نہایت شستہ شعری وادبی ذوق رکھتا تھا اور اچھی تنقیدی بصیرت سے بہرہ ور تھا۔ اس کی شاہانہ فیاضیوں کے باعث ایران وہندوستان کے علماء وماہرین فن اس کے دربار میں سمٹ آئے۔ ان میں عالم، شاعر، انشاء پرداز، مورخ تھے تو خطاط، مصور اور موسیقار بھی تھے۔ عظیم موسیقار تان سین (م ۱۵۸۹) کا اکبر کے نورتنوں میں شمار ہوتا تھا۔ اکبر کا دربار کیا تھا ایک چشمۂ شیریں تھا جس کے گرد مردم ومرغ وموراپنی پیاس بجھانے کے لیے جمع ہوگئے تھا۔

ہر کجا بود چشمۂ شیریں مردم و مرغ و مور گرد آیند (سعدی)

ان ارباب فضل وکمال میں بیشتر اکبر کے دربار سے براہ راست وابستہ تھے تو کچھ امراء وعمائد سلطنت کی فیاضیوں سے سیراب ہو رہے تھے۔

اکبر کی علم نوازی اور علماء پروری کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ اس نے اپنے دربار میں

---

* فیصل ولا، نیا پارا، ضلع دھمتاری۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ فیضی کو اکبر نے سفارت پر دکن بھیجا تو معاملات کی پیچیدگیوں نے اسے دو سال تک ہلنے نہیں دیا اور یہاں کے ہر موسم کے تجربہ کا موقع ملا (۳۰)۔ چنانچہ فیضی نے اپنے خطوط میں وہاں کی آب و ہوا، عمارتوں، قلعوں، کھیت، کھلیانوں، کارخانوں، پھلوں وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اہل فن اور ارباب کمال کے حالات لکھے۔ ملک قمی اور ظہوری کی بڑی تعریف کی اور ان کے عمدہ اشعار نقل کیے۔ ان خطوط کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ شاعر و مصنف ہوتے ہوئے بھی امور مملکت اور معاملات سلطنت سے کس قدر باخبر تھا۔

۹۹۷ھ/۱۵۸۸ء میں اکبر کشمیر گیا تو فیضی اس کے ہم راہ تھا، فیضی کا دوست عرفی شیرازی بھی ہم رکاب تھا۔ فیضی نے قصیدۂ کشمیریہ اسی سفر میں لکھا تھا۔ سو اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ فیضی کے شاعرانہ کمالات کا مظہر ہے۔ یہ مشہور مطلع اسی قصیدے کا ہے۔

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر		کہ بار عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر (۳۱)

۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء میں اکبر کو جب دینی سیادت کی دھن سوار ہوئی تو اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر منصب امامت و اجتہاد کو مسلم کرنا ہے تو خلفائے راشدینؓ کے طرز پر جمعہ میں خطبہ پڑھنا چاہیے کیونکہ امیر تیمور اور مرزا الغ بیگ گورگان بھی پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ اس نے فتح پور کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دینے کی کوشش کی۔ یہ خطبہ فیضی کا لکھا تھا، اکبر جب منبر پر گیا تو تھر تھر کانپنے لگا اور فیضی کے تین شعر مشکل سے پڑھ سکا اور وہ بھی اس طرح کہ برابر سے کوئی بتاتا جاتا تھا۔

خداوندے کہ ما را خسروی داد		دل دانا و بازوے قوی داد
بہ عدل و داد ما را رہنموں کرد		بجز عدل از خیال ما بروں کرد
بود وصفش ز حد فہم برتر		تعالیٰ شانہ اللہ اکبر

(جس خدا نے ہم کو بادشاہت عطا کی ہے اسی نے ہم کو دل دانا اور بازوے قوی عطا کیا ہے۔ عدل و انصاف کو ہمارا رہنما بنایا اور عدل کے سوا ہر چیز کو ہمارے خیال سے نکال دیا۔ اس کی توصیف حد فہم سے بالاتر ہے۔ اس کی شان بلند ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے)۔ (۳۲)

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ فیضی کو اکبر کتنا عزیز رکھتا تھا۔ بایں ہمہ فیضی نے جاہ و منصب کی طمع میں اپنے علم و فن کی آبرو نہیں کھوئی۔ بقول علامہ شبلیؒ ایشیائی درباروں

میں خوشامد اور تملق کے بغیر کوئی شخص فروغ نہیں پا سکتا تھا لیکن فیضی نے علم کی آبرو رکھی۔ اس نے یہ گوارا کیا کہ باوجود اس قدر تقرب اور ہم نشینی کے اس کا منصب چار صدی سے نہ بڑھا حالانکہ اس کا چھوٹا بھائی ابوالفضل دونیم ہزاری تھا لیکن اوروں کی طرح اس نے اپنی عزت نفس کو برباد نہیں کیا۔ اس کی جس قدر بھی عزت تھی اس کے فضل و کمال کی وجہ سے تھی۔ مآثر الامراء کے مولف صمصام الدولہ شاہ نواز خاں (۱۱۱۱ھ-۱۱۷۱ھ) بھی ملا عبدالقادر بدایونی کی طرح فیضی سے خوش نہ تھے۔ تاہم وہ فیضی کی اس خوبی کا اعتراف کرتے ہیں:

"پیش آمد مصاحبت شیخ در پیش گاہ خلافت بہ عنوان علم و کمال بود زیادہ بر چہار صدی منصب نیافت"۔ (۳۳)

تصانیف و تراجم: فیضی کی ذہانت اور علمی استعداد تاریخ میں ضرب المثل ہو چکی ہے۔ شاہ نواز خان نے مآثر الامراء میں اس کو ایک سو ایک کتابوں کا مصنف بتایا ہے۔

مہابھارت تقریباً ایک لاکھ اشعار پر مشتمل سنسکرت میں دنیا کی طویل ترین رزمیہ نظم ہے۔ ۱۵۸۲ میں اکبر کے حکم پر فارسی میں اس کا ترجمہ کرنے کے لیے جید الاستعداد علما و شعراء کا جو بورڈ بنایا گیا تھا اس میں ملا عبدالقادر بدایونی، ملا شیری، نقیب خاں اور حاجی سلطان تھانیسری کے علاوہ فیضی بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ فیضی نے مہابھارت کے دو ابواب کا ترجمہ کیا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ فیضی نے ترجمے کی زبان کو سلیس اور فصیح بنایا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ فیضی نے اس کا دیباچہ لکھا تھا۔ محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ بہت سے مصنف اور مترجم مصروف رہے، تیار ہو کر باتصویر لکھی گئی اور مکرر لکھی گئی۔ "رزم نامہ" نام پایا۔ شیخ ابوالفضل نے اس پر دیباچہ لکھا (۳۴)، ۹۸۳ھ میں بہاون نامی ایک پنڈت دکن سے آکر بہ رضا و رغبت مسلمان ہو گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کی مدد سے اتھروید کا ترجمہ شروع کیا لیکن اس کو وہ پورا نہ کر سکے۔ پھر فیضی اور حاجی ابراہیم سرہندی نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی (۳۶)، فیضی نے سنسکرت میں فن ریاضی کی مشہور کتاب "لیلاوتی" کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا، شعراء کا ایک تذکرہ "مقاصد الشعراء" فیضی سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ تذکرہ تمام ہوا یا نہیں کچھ پتا نہیں۔ فیضی اپنے دوست حسن کالپی والی کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

''کتاب مقاصد الشعراء را البتہ چوں	جب آئیں تو مقاصد الشعراء ضرور لیتے آئیں
تشریف آرند ہمراہ آرند کہ اختتام تذکرہ	کیونکہ تذکرہ کا اختتام اس پر موقوف ہے۔
موقوف بہ آں ماندہ و از کتب دیگر ہم	ہو سکے تو دوسری کتابوں سے بھی انتخاب
آنچہ تو انند استنباط فرمودہ فرمانید کہ فقیر	فرمائیں۔فقیر اس کے دیباچہ میں آپ کا ذکر
می خواہم در خطبہ آں ذکر شریف کنم''۔	شریف بھی کرنا چاہتا ہے۔(۳۶)

حکیم عین الملک (م ۱۰۰۳ھ) کا بیٹا نورالدین محمد عبداللہ فیضی کا بھانجہ اور شاگرد تھا اس نے ۱۰۳۵ھ میں فیضی کے تمام مکاتیب و خطوط کو مرتب کیا اور اس کا نام لطیفہ فیضی رکھا۔فیضی کے خطوط و مراسلات اس زمانے کے تمدن، معاشرتی آداب و رسوم اور تہذیبی اوضاع و اطوار کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔بقول شبلیؒ ان خطوط سے فارسی انشاء میں سادہ نگاری کی ابتداء ہوئی ورنہ اس سے پہلے بیان واقعہ کے بجائے انشاء پردازی مقصود تھی۔(۳۷)

ایک مثنوی راجع بہ گجرات اور اساتذہ کی نثر و نظم کا انتخاب باسم ''گلدستہ نثر و نظم'' بھی فیضی سے منسوب کیا جاتا ہے۔بھگود گیتا کا منظوم ترجمہ، ایک غیر منقوط رسالہ ''اکبر''، جوگ بشسٹ کا ترجمہ، ویدانت پر شارق المعرفت بھی فیضی سے منسوب ہیں لیکن سید صباح الدین عبدالرحمٰن فیضی سے ان تمام کتابوں کے انتساب کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں کہ فیضی اور ابوالفضل نے اپنی تحریروں میں کہیں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔رامائن کے ترجمے کا انتساب بھی فیضی سے درست نہیں۔ رامائن کا ترجمہ ملا عبدالقادر بدایونی نے ۹۷-۹۹۶ھ/۱۵۸۷ میں کیا تھا جس کے صلے میں اکبر نے اسے ایک شال، گھوڑا اور خرچ دیا تھا۔(۳۸)

۱۵۹۳ میں فیضی نے عربی زبان میں قرآن کریم کی تفسیر صنعت غیر منقوط میں لکھی جس کا نام ''سواطع الالہام'' ہے۔مالک رام کہتے ہیں کہ یہ پورے قرآن کی تفسیر ہے لیکن والہ داغستانی کے خیال میں یہ صرف نصف قرآن کی تفسیر ہے۔(شیخ فیضی نصف قرآن را بے نقط تفسیر کردہ) اس تفسیر کی ضخامت ۷۵ جزء ہے۔تقریباً ایک ہزار بیت کا دیباچہ ہے جس میں اپنے باپ بھائیوں اور اپنے حصول علم کا حال لکھا ہے اور بادشاہ کی مدح سرائی کی ہے۔فیضی نے ننانوے غیر منقوط فقروں سے دو ڈھائی برس کی مدت میں اس تفسیر کو مکمل کیا۔(۳۹)

ملا عبدالقادر بدایونی اور متعدد علمائے عصر نے اس پر تقریظیں لکھیں۔ شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴-۱۶۲۴) کے استاد مولانا یعقوب کشمیری (۱۵۰۲-۱۵۹۵) نے عربی زبان میں تقریظ لکھی۔ ملا صاحب، میاں امان اللہ سرہندی اور میر حیدر معمائی رفیعی (م ۱۰۳۲ھ) نے تاریخ نکالی۔ ملک قمی (م ۱۶۱۶) نے رباعیاں لکھیں اور ظہوری (م ۱۶۱۵) نے قصیدہ لکھا۔(۴۰)

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق لاہور کے مشہور عالم "اعلم العلماء" مولانا جمال تلوی نے تفسیر سواطع الالہام کی تیاری میں فیضی کی مدد اس طرح کی کہ اس کی اصلاح کر کے مربوط بنایا (تفسیر شیخ فیضی را اکثرے او اصلاح دادہ و مربوط ساختہ)۔ بدایونی کے اس بیان پر مولانا محمد حسین آزاد مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

"ملائے بدایونی یہ بھی فرماتے ہیں کہ تفسیر میں مولانا جمال تلہ نے بہت اصلاح کی ہے اور درست کر دی ہے۔ خیر یہ جو چاہیں فرمائیں"(۴۱)، اس مقام پر یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ مولانا جمال الدین تلوی کی استدعا پر ہی شیخ احمد سرہندی نے وحدت الوجود کی وضاحت کی تھی اور وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا تھا۔ زبدۃ المقامات (سال تکمیل ۲۸-۱۶۲۷) کے مصنف خواجہ محمد ہاشم کشمی (م ۱۶۴۳) کا بیان ہے کہ تفسیر سواطع الالہام کا ایک صفحہ جو فیضی صنعت غیر منقوط میں نہیں لکھ پا رہا تھا اسے شیخ احمد نے لکھا تھا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی اس امر کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا ہے، ہم یہاں زبدۃ المقامات کی عبارت نقل کرتے ہیں تاکہ بات پوری طرح واضح ہو جائے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی لکھتے ہیں "ایک روز حضرت (مجدد) ابوالفضل کے بھائی ابوالفیض (فیضی) کے مکان پر گئے۔ وہ تفسیر غیر معجمہ کے لکھنے میں مشغول تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو بڑا خوش ہوا اور کہا کہ آپ اچھے وقت آئے۔ اس وقت میں تفسیر کے لیے ایک ایسی بات لکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے غیر منقوط الفاظ نہیں ملتے۔ بہت دماغ سوزی کی لیکن خاطر خواہ عبارت نہیں لکھ سکا۔ آپ نے اسی وقت باوجودیکہ آپ کو غیر منقوط عبارت لکھنے کا محاورہ نہ تھا، اس مقام کی تفسیر اس طرح فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھ دی کہ فیضی حیران رہ گیا" (۴۲)، حضرات القدس کے مصنف شیخ بدرالدین سرہندی اور مشائخ کے تذکروں کے دیگر معاصر مصنفین بھی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ تفسیر سواطع الالہام کا معتدبہ حصہ شیخ احمد کے قلم کا ثمرہ ہے۔(۴۳)

سید اطہر عباس رضوی زبدۃ المقامات (ص ۱۳۲) اور حضرات القدس (ج ۲، ص ۳۳) سے یہ بیانات نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میں اپنی کتاب میں ثابت کر چکا ہوں کہ ان دعووں کی تائید و تصدیق دیگر کتب سے نہیں ہوتی نیز یہ کہ ان میں سہو زمانی پایا جاتا ہے۔ (۴۴)

ایک طرف رضوی صاحب لکھتے ہیں کہ زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کے علاوہ دیگر تذکرے اور سوانح عمریاں بھی سواطع الالہام کی تصنیف میں شیخ احمد کی شرکت و معاونت کا دعوی کرتی ہیں اور دوسری طرف یہ لکھتے ہیں کہ ان دعووں کی تائید و تصدیق دیگر ذرائع سے نہیں ہوتی۔ رضوی صاحب کی آرا پر مزید تبصرہ سے گریز کرتے ہوئے سر دست بس اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ موصوف نے اپنی انگریزی نگارشات میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ جیسے صاحبان تجدید و طریقت کے علمی و دینی کارناموں کے محاکے میں جس طرح کا غیر معروضی طریقہ اختیار کیا ہے اور جس طرح ان کا استخفاف کیا ہے اس سے تاریخ دعوت و عزیمت کا ہر سنجیدہ قاری واقف ہے۔

خواجہ محمد ہاشم کشمی اور شیخ بدرالدین سرہندی حضرت شیخ احمد کے نہ صرف ہم عصر تھے بلکہ ان کے مریدان باصفا میں شامل بھی تھے۔ زبدۃ المقامات اور حضرات القدس معاصر سوانح عمریاں ہیں۔ خود رضوی صاحب کا بیان ہے کہ خواجہ محمد ہاشم کشمی ۱۰۳۱ھ/۲۲-۱۶۲۱ میں شیخ احمد کے حلقۂ ارادت و بیعت میں شامل ہوئے اور زبدۃ المقامات (جس کا دوسرا نام برکات الاحمدیت الباقیہ ہے)، انہوں نے اپنے پیر کی وفات کے صرف تین سال بعد ۱۰۳۷/۲۸-۱۶۲۷ میں مکمل کی۔ حضرات القدس کے مصنف شیخ بدرالدین سرہندی ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ میں شیخ احمد کے حلقۂ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے اور حضرات القدس ۱۰۵۳ھ/۱۶۴۳ میں مکمل کی۔ حضرات القدس دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں حضرت ابوبکر صدیقؓ (۵۷۳-۶۳۴) سے حضرت خواجہ باقی باللہؒ (۱۵۶۳-۱۶۰۳) تک نقشبندی صوفیہ کے حالات ہیں اور دوسری جلد تمام تر شیخ احمد کے بیان میں ہے جس میں ان کی زندگی، تعلیمات اور کرامات کے علاوہ ان پر کی گئیں تنقیدوں کے مفصل و شافی جوابات دیے گئے ہیں۔ رضوی صاحب سواطع الالہام کی تیاری میں شیخ احمد کی شرکت و معاونت کی تردید تو کرتے ہیں لیکن ملا عبدالقادر بدایونی کے منقولہ بالا بیان کے متعلق کیا کہیں

گے جس میں ملا صاحب کہتے ہیں کہ مولانا جمال الدین تلوی (جو شیخ احمد کے مرید بھی تھے) نے سواطع الالہام کی اصلاح کر کے اسے مربوط بنایا تھا (۴۵)، یہاں وہ شعر یاد آ رہا ہے جو شبلیؒ نے ملا صاحب کی دو رنگیوں کے متعلق لکھا ہے جس میں شاعر کہتا ہے کہ میں ہر گھڑی ایک نئی مصیبت میں اس لیے گرفتار ہوتا ہوں کیونکہ ظلم کرتے کرتے محبوب سے کوئی ادا محبت کی بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ محبوب کی یہ دو رنگی اور بھی مصیبت ہوتی ہے۔

ازاں بہ درد دگر ہر زماں گرفتارم کہ شیوہ ہاے ترا باہم آشنائی نیست

تفسیر سواطع الالہام لکھنے سے پہلے فیضی نے ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں ابتدائی مشق کے طور پر عربی میں موارد الکلم لکھی تھی۔ لیکن آزاد کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ فیضی نے سواطع الالہام لکھنے کے بعد موارد الکلم قلم بند کی تھی، موارد الکلم کا تاریخی نام موارد الکلم سلک درر الحکم ہے۔ اس کا موضوع علم اخلاق ہے۔ اس میں فیضی نے چھوٹے چھوٹے فقروں میں اخلاقی مطالب ادا کیے ہیں۔ (۴۶)

فیضی کا مذہب: فیضی جس زمانے میں پیدا ہوا وہ سخت فکری اور اعتقادی انتشار و تزلزل کا دور تھا۔ غلط رسوم و رواج اور بدعتوں سے دینی و اخلاقی فضا سخت مسموم ہو رہی تھی۔ مزید یہ کہ "فقہائے مکر و حیل اور علمائے دجل و فساد" نے شرعی احتساب اور خدمت اسلام کے نام پر جبر و تشدد کا طوفان برپا کر رکھا تھا۔ مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبد النبی کے ذریعہ حیلوں، بہانوں سے اہل علم اور ارباب دعوت و عزیمت کی تضلیل و تکفیر کا بازار گرم تھا۔ جاہ و منصب کے لیے ان کے نزدیک قانون شریعت کا بھی پاس نہیں تھا۔ کوشش تھی تو ایک دوسرے کو کوتاہ قد اور ساقط الاعتبار ٹھہرانے کی تھی شرعی احکام و امور کے ساتھ مذاق اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ ایک جس چیز کو حرام کہتا دوسرا اس کی ضد میں اسے حلال قرار دیتا تھا۔ فیضی جید اور صاحب نظر عالم تھا اور دین بزرگاں کو آنکھ بند کر کے ماننے والا نہ تھا۔

مذہبی تنگ نظری سے دور اور فتوی باز مولویوں کی روش سے سخت نفور تھا۔ "اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی" کے مصداق اس کی غیر معمولی ذہانت ہی اس کے لیے کیا کم باعث فتنہ تھی، اس پر مستزاد اس کی آزاد خیالی اور فراخ مشربی۔ چنانچہ شیخ مبارک اور ابوالفضل کے ساتھ اس کو بھی

کبھی رافضی اور کبھی مہدوی کہا گیا حتیٰ کہ الحاد و زندقہ کے اتہامات اس پر عائد کیے گئے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اکبر کے الحاد و انکار پر مفصل بحث کی ہے اور اس کی گمراہی کے لیے شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹوں، ابوالفضل اور فیضی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا ندویؒ نے ملا عبدالقادر بدایونی کے بیانات کی صحت و استناد کو تسلیم کرکے ایلیٹ کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ملا مبارک، ابوالفضل، فیضی وغیرہ کی نسبت منتخب التواریخ کے بیانات کو مجروح اور ساقط الاعتبار قرار دینا ایک غیر علمی طریق کار ہے۔ مولانا ندویؒ کے اس خیال کو بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، تاہم ملاے بدایونی نے فیضی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس میں اس کے ذاتی عناد وتعصب کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ضرور ہے کہ شیخ مبارک اور ابوالفضل کی گمراہی و ضلالت کے متعلق ملاے بدایونی کے بیانات کی تائید وتوثیق منتخب التواریخ کے علاوہ دیگر باوثوق ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ تفصیل اس کی آگے آئے گی۔ یہاں ہم ملا عبدالقادر بدایونی کے وہ الفاظ نقل کرتے ہیں جو انہوں نے فیضی کی نسبت استعمال کیے ہیں۔

”مخترع جدول ہزل و عجب و کبر و حقد و مجموعہ نفاق و خباثت و ریا و حب جاہ و خیلاء و رعونت بود۔ در وادی عناد و عداوت با اہل اسلام وطعن در اصل اصول دین و اہانت مذہب و مذمت صحابہ کرام و تابعین و سلف و خلف، متقدمین و متاخرین و مشائخ و اموات و احیاء و بے ادبی و بے تحاشی نسبت بہمہ علماء و صلحاء و فضلاء سراً و جہاراً لیلاً و نہاراً۔ ہمہ یہود و نصاریٰ و ہنود و مجوس برو ہزار شرف داشتند“۔ (۴۸)

سفاہت اور سفلہ پن کا موجد، غرور، گھمنڈ اور کینہ کا مخترع، نفاق، خباثت، ریا، حب جاہ، نمود اور شیخی کا مجموعہ تھا۔ اہل اسلام کے عناد و عداوت کی وادی میں اور دین کے بنیادی اصولوں پر طعنہ زنی میں، مذہب کی توہین اور صحابہ کرام و تابعین کی مذمت میں اور اگلے پچھلے متقدمین متاخرین مشائخ کے باب میں جو گزر چکے ہیں اور جو زندہ ہیں بے دھڑک بے ادبی کرتا تھا۔ تمام علماء و صلحاء و فضلاء کے باب میں خفیہ اور ظاہر، رات اور دن یہی حال تھا۔ یہودی، عیسائی، ہنود اور مجوس اس سے ہزار درجہ بہتر تھے۔

ملا صاحب اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ آگے فرماتے ہیں ”تمام حرام چیزوں کو دین محمدی کی ضد میں مباح اور فرائض کو حرام جانتا تھا۔ جو بدنامی سو دریاؤں کے پانی سے نہ دھوئی جائے گی،

اس کے دھونے کو تفسیر بے نقط عین حالت مستی و جنابت میں لکھتا تھا جسے کتے اِدھر اُدھر پامال کرتے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ اسی انکار اور غرور کے ساتھ اصلی قرارگاہ کو بھاگ گیا اور ایسی حالت سے گیا کہ خدا دکھائے نہ سنائے"۔ (۴۹)

اس کے آگے ملا صاحب فرماتے ہیں کہ "جب اکبر اس کو دیکھنے کے لیے گیا تو اس (فیضی) کے ہونٹ سیاہ ہو چکے تھے اور وہ کتوں کی طرح بھونک رہا تھا" (۵۰) اس کے بعد ملا صاحب فیضی کے اس عبرت ناک انجام سے متعلق لکھتے ہیں:

"بے شک جو مذمت اور طعن حضرت خاتم المرسلینؐ کی شان میں کرتا تھا اس کے مقابل میں یہ باتیں پھر بھی بہت کم تھیں"۔ (۵۱)

لیکن جب ہم ملا صاحب کے ان بیانات کا تاریخی حقائق اور فیضی کی نگارشات نظم و نثر کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہیں تو واقعیت وہ نظر نہیں آتی جس کی تصویر بدایونی نے کھینچی ہے۔ پہلے فیضی کے اخلاق و عادات جیسے غرور، رعونت، خباثت، منافقت، حب جاہ وغیرہ کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

حب جاہ بیشتر اخلاقی منکرات کی جڑ ہے، اس کا مرتکب کسی بھی برائی سے اجتناب نہیں کرتا، فیضی کے بارے میں یہ سب جانتے ہیں کہ وہ صدفی صد علمی و ادبی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اصل مذاق علم و فن کی خدمت تھی۔ ۴۶۰۰ کتابوں پر مشتمل اس کا کتب خانہ اس کے علمی انہماک و استغراق کا واضح ثبوت ہے۔ اس کو اپنے قلم کی حرمت عزیز تھی جس کی اس نے ہمیشہ حفاظت کی اور کبھی کسی عہدے یا منصب کی لالچ نہیں کی بلکہ وہ ان چیزوں سے ہمیشہ بچتا رہا۔ بہتر ہوگا کہ مآثر الامراء کے مصنف شاہ نواز خاں اور علامہ شبلی نعمانیؒ کی آرا کو یہاں ایک بار پھر ملاحظہ کر لیا جائے، علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

"فیضی نے یہ گوارا کیا کہ باوجود اس قدر تقرب اور ہم نشینی کے اس کا منصب چار صدی سے نہ بڑھا حالانکہ اس کا چھوٹا بھائی ابوالفضل دو نیم ہزاری تھا لیکن اوروں کی طرح اس نے عزت نفس کو برباد نہیں کیا۔ اس کی جس قدر بھی عزت تھی اس کے علم و فضل کی وجہ سے تھی۔ صاحب مآثر الامراء فیضی سے خوش نہیں تاہم فرماتے ہیں: "پیش گاہ مصاحبت شیخ در پیش گاہ خلافت بہ عنوان علم و

کمال بود زیادہ بر چہار صدی منصب نیافت'' ۔(۵۲)

ملا صاحب فرماتے ہیں کہ فیضی بڑا مغرور و متکبر اور بد اخلاق تھا۔ اس کے اندر رعونت اور خباثت بہت تھی۔ شبلی نے ملا صاحب کے اس اتہام پر اظہار افسوس کیا ہے اور لکھا ہے کہ فیضی تو بڑا حلیم اور نیک نفس تھا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور محمد حسین آزاد دونوں فیضی کی فیاضی اور خوش اخلاقی کے قائل ہیں۔ آزاد نے تو یہ تک لکھا ہے کہ ''فیضی کا دیوان خانہ علماء، شعراء اور اہل کمال کے لیے ہوٹل تھا۔ اپنے بیگانے دوست دشمن سب کے لیے دروازہ کھلا اور دستر خوان بچھا ملتا تھا'' ۔(۵۳) آزاد کے اس بیان پر غور فرمایئے جس شخص کے دیوان خانے میں ارباب فضل و کمال کا ہجوم رہتا ہو اور جس کا دروازہ اپنے بیگانے سب کے لیے کھلا رہتا ہو وہ شخص خلیق، منکسار اور بردبار ہوگا یا مغرور و متکبر اور تند خو ہوگا۔

شاعروں میں جو باہمی چشمک اور معرکہ آرائی ہوتی ہے اس سے کون واقف نہیں لیکن فیضی اس معاملے میں بھی بڑا وسیع القلب واقع ہوا تھا۔ وہ اپنے ہم عصر شعراء و ادباء کے صرف نام ہی بڑی عزت سے نہیں لیتا تھا۔ ان کی عزت بھی کرتا تھا اور ان کی مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ وہ جب دکن گیا تو سفارتوں کے پیچیدہ معاملات کے باوجود ملک قمی (م ۱۶۱۶) اور ظہوری (م ۱۶۱۵) سے ملا۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ ملک قمی کا دیوان دکن سے سب سے پہلے فیضی ہی لایا تھا۔ اس نے احمد نگر سے اکبر کے نام جو عرض داشت لکھی تھی اس میں ان دونوں باکمال شاعروں کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

''در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد صافی مشرب اند و در شعر رتبہ عالی دارند۔
یکے ملک قمی کہ بہ کس کمتر اختلاط می کند ہمیشہ مژہ تر می دارد۔ دیگر ملا ظہوری کہ
بغایت رنگیں کلام ست و در مکارم اخلاق تمام عزیمت آستاں بوس دارد'' ۔(۵۴)

ملا صاحب اور مصنف منتخب اللباب خافی خاں نے اپنی تحریروں میں یہ تاثر دیا ہے کہ فیضی عرفی کا سب سے بڑا متعصب اور حاسد حریف تھا لیکن فیضی کے خطوط سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عرفی کا بڑا مداح اور قدرداں تھا۔ عرفی جب ایران سے آیا تو بہت دنوں تک فیضی کے گھر پر مقیم رہا۔ فیضی اس کی کفالت کرتا رہا۔ اپنے ایک خط میں وہ عرفی کے حسن اخلاق اور خاکساری کی

تعریف کرتا ہے اور شعر وفن میں اس کی بلندی وقدرت کلام، ایجاد معانی وچاشنیٔ الفاظ نیز اس کی سرعت فکر ودقت نظر کا اعتراف کر کے اس کی سخنوری کی داد دیتا ہے۔

"بہ بلندی ووفور قدرت وایجاد معانی وچاشنی الفاظ وسرعت فکر ودقت نظر فقیر کسے راچوں او ندیدہ ونشنیدہ، واز تہذیب اخلاق چہ گوید کہ درخاکی نہاد شیر از ذاتی می باشد نہ کسبی"۔(۵۵)

میر حیدر معمائی رفیعی نے سورۂ اخلاص سے تفسیر سواطع الالہام کی تاریخ نکالی تو فیضی نے ان کو دس ہزار روپے انعام دیے۔ ۱۵۷۲ میں غزالی مشہدی کا انتقال ہوا تو فیضی نے تاریخ کہی۔ فیضی کے حسن اخلاق اور کشادہ دلی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ ۱۰۰۰ھ میں ملا صاحب بعض وجوہ سے اکبر کی نظروں سے گر گئے اور دربار کی حاضری سے محروم ہوگئے تو فیضی کو اس سے بڑا دکھ ہوا اور اس نے احمد نگر سے اکبر کو ایک سفارشی خط لکھا جس میں اس نے ملا صاحب کے علم و فضل اور اخلاق کمالات کی بے حد تعریف کی، لیکن ملا صاحب کی مروت ووفا دیکھیے کہ اس سفارشی خط کو منتخب التواریخ میں نقل تو کیا لیکن فیضی کے اس احسان کا شکر گزار ہونے کے بجائے یہ کہہ کر اس کی مذمت کی کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن کیا کیا جائے۔ دین کی حفاظت اور اس کا حق تمام حقوق سے بالاتر ہے (لتا چہ تواں کرد کہ حق دین وحفظ عہد آں بالاتر از ہمہ حقوق است۔ الحب للہ و البغض للہ)۔(۵۶)

ملا صاحب کا ایک الزام یہ بھی ہے کہ فیضی علماء ومشائخ سے نفرت کرتا تھا اور فقراء اور اہل اللہ سے بڑی گستاخی اور بے باکی سے گفتگو کرتا تھا۔ علامہ شبلیؒ نے فیضی کے ترجمۂ احوال میں ایک سرخی "درویش پرستی" کی بھی قائم کی ہے اس سرخی کے تحت مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں:

"فیضی فقراء اور اہل اللہ کا نہایت گرویدہ تھا اور اکثر بزرگوں کے مزار پر حاضر ہوتا تھا۔ خواجہ فریدالدّین شکر گنج کی خدمت میں خاص ارادت تھی۔ ان کے مزار پر جب گیا ہے تو کئی قطعے لکھے ہیں"۔

اس کے بعد شبلیؒ نے اس کے متعدد قطعے نقل کیے ہیں۔ شبلیؒ نے فیضی کا ایک خط بھی نقل کیا ہے جس میں وہ اپنے ایک دوست سے تذکرۃ الاصفیاء اور مشائخ ہند کے احوال وافکار پر مشتمل

دیگر کتب ورسائل فراہم کرنے کی گزارش کرتا ہے۔

قاضی ارتضیٰ علی خاں گوپاموی اور مولانا فضل امام خیرآبادی نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ سعد الدین خیرآبادی (م ۹۲۲ھ) کے مرید حضرت شیخ نظام الدین اللہ دیا (۸۸۶-۹۹۳ھ) سے فیضی کو اس قدر عقیدت تھی کہ ان کے وصال کے چھ ماہ بعد آگرہ کے معماروں سے ان کے مزار کی تعمیر کرائی۔ ان کی وفات پر فیضی نے نظم بھی لکھی تھی جس کے اشعار مزار کے در و دیوار پر ثبت ہیں۔ حضرت شیخ نظام الدین اللہ دیا کا مزار خیرآباد (ضلع سیتاپور) میں ہے۔ وہ ''چھوٹے مخدوم'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ملا صاحب کی منتخب التواریخ کے علاوہ اخبار الاخیار اور بحر زخار (مصنفہ وجیہ الدین اشرف) میں بھی ان کے حالات درج ہیں۔ (۵۷)

معاصر تذکروں اور سوانح عمریوں سے یہ بات ثابت ہے کہ شیخ احمد سرہندی فیضی کے گھر آتے جاتے تھے۔ تفسیر سواطع الالہام کے بیان میں ہم ان دونوں حضرات کے مخلصانہ مراسم کا ذکر کر چکے ہیں۔ واضح رہے کہ ان مراسم کی ابتداء شیخ احمد سرہندی کے استاد مولانا یعقوب کشمیری کی وساطت سے ہوئی تھی۔ شیخ احمد سرہندی کے علاوہ فیضی کو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے بھی بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ وہ شیخ محدث کا اس قدر مداح اور شیدائی تھا کہ جب شیخ محدث پانچ سال کے بعد ۱۵۹۰ میں سفر حجاز سے واپس آئے تو اس نے ہر امکانی کوشش کی کہ شیخ محدث اس کے حلقۂ احباب میں پھر شامل ہو جائیں۔ اس نے اس سلسلے میں کئی خط شیخ کو لکھے، ایک خط میں اس نے شیخ کو ''ملک الاحباء'' بھی لکھا ہے۔ لیکن شیخ نے ملاقات کا دیرینہ سلسلہ تازہ نہ کیا۔ بقول شیخ محمد اکرام شاید شیخ کو اس تفاوت کا اندازہ نہ تھا جو فتح پور سیکری والے فیضی اور تفسیر غیر منقوط والے فیضی میں واقع ہو گئی تھی لیکن شیخ سے فیضی کی عقیدت کم نہ ہوئی۔ (۵۸)

بات دراصل یہ ہے کہ شیخ مبارک ناگوری کا خاندان مخدوم الملک اور صدر الصدور کے ظلم وستم کا قتیل تھا۔ فیضی چونکہ شاعر تھا اور شاعر کا زود احساس ہونا معلوم، اس لیے اس پر ان چیرہ دستیوں کا اثر یہ ہوا کہ وہ نہ صرف مخدوم الملک اور صدر الصدور سے متنفر ہو گیا بلکہ بعض دوسرے علماء سے بھی بدگمان ہو گیا۔ پھر یہ بدگمانی رفتہ رفتہ ضد اور کد میں بدل گئی جو فتح پور سیکری کی نجی محفلوں میں زبان پر آتی رہی تھی۔ یہ ایک طرح کی شوخی اور بے تکلفی تھی جس کی طرف شیخ عبدالحق

محدث دہلویؒ نے بھی اشارہ کیا ہے لیکن اس سلسلے میں دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ فیضی یہ شوخی اور بے تکلفی ہر بزرگ کے ساتھ روا نہیں رکھتا تھا بلکہ مخدوم الملک صدر الصدور اور ان کی طرح کے دوسرے علمائے عبید الدنیا تک محدود رکھتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ فیضی کا یہ رویہ اس کی زندگی کے اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب وہ فتح پور سیکری میں محفلیں آراستہ کرتا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کو چونکہ فتح پور سیکری والے فیضی سے ملاقات کا تجربہ تھا اس لیے پیہم گزارشوں کے باوجود وہ فیضی سے تجدید دوستی کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شیخ محدث کو اس تبدیلی کا اندازہ نہ تھا جو بعد میں فیضی کے افکار و خیالات میں آگئی تھی۔ شیخ محمد اکرام کے بیان سے فیضی کی مذہبی زندگی کے ایک اہم نقطہ انحراف کی نشاندہی ہوتی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فیضی سے متعلق ملا عبدالقادر بدایونی کے بیانات کو بنیاد بنا کر شیخ مبارک اور ابوالفضل کی طرح فیضی کو بھی عقائد میں تزلزل و انتشار کا حامل بتایا ہے اور اکبر کو ملحد و بدمذہب بنانے میں اس کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا ہے لیکن غالباً مولانا کی نظر اس تبدیلی کی جانب نہیں ہوئی جس کی طرف شیخ محمد اکرام نے اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سے فیضی کی جو تصویر سامنے آئی اس سے یہی ثابت ہوگا کہ وہ زندگی بھر الحاد و زندقہ میں مبتلا رہا اور ملا صاحب نے اس کی موت کا جو عبرت ناک نقشہ کھینچا ہے اس کے متعلق عرض ہے کہ "منتخب التواریخ، زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے کہ شیخ احمد کے استاد مولانا یعقوب کشمیری نے فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کی تقریظ عربی زبان میں لکھی تھی۔ اور شیخ احمد کے مرید "اعلم العلماء" مولانا جمال الدین تلوی نے اصلاح کر کے اسے مربوط بنایا تھا۔ خود شیخ احمد نے تفسیر کی تکمیل میں فیضی کی معاونت کی تھی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی ذکر فرمایا ہے کہ آگرہ میں شیخ احمد کی فیضی کے ساتھ صحبتیں رہتی تھیں۔ اسی زمانے میں شیخ احمد نے تفسیر میں فیضی کی مدد کی۔ فیضی آپ کی علمی استعداد سے بے حد متاثر ہوا۔(۵۹)

ان حقائق کی روشنی میں یہ سوال قرین عقل ہے کہ اگر فیضی الحاد و زندقہ کی غلاظت میں اس وقت بھی ملوث تھا (جیسا کہ ملا صاحب نے لکھا ہے) تو کیا یہ ممکن تھا کہ یہ صاحبان علم و طریقت، جن کا تقویٰ اور خدا ترسی ایک معروف و مسلم حقیقت ہے، فیضی سے تعلق رکھتے؟ اصل یہ ہے کہ فیضی

کے والد شیخ مبارک ناگوری عقائد کے معاملے میں تلون اور انتشار کا شکار رہتے تھے۔ خواجہ باقی باللہ (۱۵۶۳-۱۶۰۳) کے صاحب زادے خواجہ کلاں (پ ۱۶۰۱) مبلغ الرجال میں لکھتے ہیں:

''در ہر عصر ہم مشرب و مذہب شعار	وہ ہر زمانے کا دہ مروجہ مذہب ومشرب
وقت خودی ساخت کہ ملوک و امرائے	اپنا لیتا تھا جس سے ملوک وامراء رغبت
عصر بداں مذہب رغبت داشتند''۔	رکھتے تھے۔

واضح رہے کہ خواجہ کلاں کی پرورش و پرداخت شیخ مبارک ناگوری کی بیٹی کے گھر ہوئی تھی جو خواجہ حسام الدین (۱۵۷۰-۱۶۳۳) کی زوجہ تھیں اس لیے ان کے بیان کو غلط کہہ کر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ خواجہ کلاں کے اس بیان کی تصدیق کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کے مقالہ نگار سرویلزلی ہیگ کے درج ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے:

''شیخ مبارک مختلف ادوار میں سنی، شیعہ، صوفی اور مہدوی کے علاوہ خدا جانے کیا کیا رہ چکا تھا''۔(۶۰)

یہاں ایک نکتہ قابل لحاظ ہے، تاریخ سے ثابت ہے کہ الحاد و زندقہ پر مبنی اس پورے نظام کی پشت پر شیخ ابوالفضل کا دماغ تھا۔ فیضی کو اس کے لیے مورد الزام قرار دینا درست نہیں۔ بقول والہ داغستانی ابوالفضل اکبر کا وزیر اعظم تھا۔ اکبر اور اس کے درباریوں نے ''دین الٰہی'' کے نام سے جو نظام مرتب کیا تھا ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق اس کا خلیفہ اعظم ابوالفضل تھا۔ اس نظام کے تحت جو اصول وقوانین وضع کیے گئے تھے ان کی تشریح کرنے اور ان کا جواز فراہم کرنے کا ''مقدس فریضہ'' ابوالفضل ہی انجام دیتا تھا(۶۱)، ابوالفضل نقطوی تحریک سے متاثر تھا۔ ہندوستان میں اسی تحریک کے داعیوں نے دوسرے ہزارے کے لیے نئے دین وآئین کی بساط تیار کی تھی۔ خواجہ کلاں نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس تحریک کی بساط ابوالفضل نے تیار کی تھی جس کے زیر اثر اس نے اکبر کو وسیع المشربی اور صلح کل کا سبق پڑھا کر جادۂ شریعت سے منحرف کیا۔ خواجہ کلاں لکھتے ہیں:

''شیخ ابوالفضل ناگوری بساط آں آئین خسارت قرین را در مملکت ہندوستان گسترد''۔(۶۲)

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ (ج ۲، ص ۱۹۹ تا ۲۰۰) میں ابوالفضل سے سخت نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ مآثر الامراء کے مصنف شاہ نواز خاں کی اطلاع کے مطابق جہاں گیر (۱۵۰۸-۱۶۲۷) نے تزک جہاں گیری میں لکھا ہے کہ "شیخ ابوالفضل نے میرے والد کے یہ ذہن نشیں کر دیا تھا کہ جناب ختمی پناہ ﷺ میں بڑی فصاحت تھی، قرآن انہیں کا کلام ہے۔ اس لیے جب وہ دکن سے آ رہا تھا تو میں نے بیر سنگھ دیو سے کہا کہ وہ اس کو قتل کر دے۔ اس کے بعد میرے والد اس عقیدے سے باز آ گئے"۔ (۶۳)

غرض تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ طریق اکبری کا خلیفۂ اعظم ابوالفضل تھا اس لیے مخالفین نے شیخ مبارک اور ابوالفضل پر اپنے اپنے ترکش خالی کیے۔ یہ دونوں تو زخمی ہوہی گئے کچھ تیر فیضی کو بھی لگے۔ (باقی)

حوالہ جات

(۱) شیخ محمد اکرام، رود کوثر، فرید بک ڈپو، دہلی ۲۰۰۳ء، ص ۸۳۔ (۲) ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۵۱۔ (۳) آئین اکبری بلوخمن کلکتہ ۱۸۸۲ء، ج ۱، ص ۲۳۵ تا ۲۶۲۔ (۴) سید صباح الدین عبدالرحمن، بزم تیموریہ، ج ۱، معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۹۵ء، ص ۳۵۴۔ (۵) محمد حسین آزاد، دربار اکبری قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۰ء، ص ۳۶۲۔ (۶) ریاض الشعراء، کتاب خانہ رام پور، ہند ۲۰۰۱ء، ص ۴۹۷۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے مرتب کیا ہے۔ (۷) دربار اکبری، ص ۳۳۰، بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۴۰۔ (۸) ایضاً۔ (۹) دربار اکبری، ص ۳۳۰۔ (۱۰) ریاض الشعراء، ص ۴۹۷۔
(۱۱) A History of Sufism in India, Vol.1, Munshiram Manohar Lal, New Delhi, 2003, P.131. (۱۲) دربار اکبری، ص ۳۳۰، حواشی تذکرہ از مالک رام۔ (۱۳) ایضاً، ایضاً، محمد حسین آزاد نے عبیداللہ احرار کی جگہ عبداللہ احرار لکھا ہے جو غلط ہے۔ (۱۴) A History of Sufism in India, Vol.II, P.174,177. (۱۵) دربار اکبری، ص ۳۳۰، حواشی تذکرہ از مالک رام، ص ۳۵۴۔
(۱۶) اخبار الاخیار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی بحوالہ رود کوثر، ص ۷۵۔ (۱۷) بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۴۰، دربار اکبری، ص ۳۳۱، حواشی تذکرہ از مالک رام، ص ۳۵۴۔ (۱۸) اخبار الاخیار اردو ترجمہ از مولانا سبحان محمود و مولانا محمد فاضل، ادبی دنیا، دہلی ۱۹۹۴ء، ص ۵۸۱۔ A History of Sufism in India, Vol.II, P.474.
(۱۹) A History of Sufism in India, Vol.II, P.472. دربار اکبری، ص ۳۳۲، مالک رام

نے آگرہ پہنچنے کی تاریخ ۱۵۵۱ لکھی ہے۔ (۲۰) شعرالعجم، ج ۳، معارف پریس اعظم گڈھ، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵۔ A
(۲۱) History of Sufism in India, Vol.II, P.472. ایضاً۔ (۲۲) ملا عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۷۸ بحوالہ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۴۰-۱۴۴۔ شعرالعجم، ج ۳، ص ۲۶۔ حواشی تذکرہ از مالک رام، ص ۳۶۳۔ (۲۳) شعرائے کشمیر، ج ۳، ص ۱۸۷-۱۸۸، مرتبہ حسام الدین راشدی بحوالہ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۷۶۔ آئین اکبری، ص ۲۴۳ و مابعد۔ شیخ محمد اکرام نے رود کوثر (ص ۱۳۵) میں لکھا ہے کہ فیضی کی وفات لاہور میں ہوئی لیکن یہ بات درست نہیں۔ (۲۴) ابوالکلام آزاد تذکرہ، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۳۸-۳۹، مہدی حسین ناصری، سنادید عجم شانتی پریس الہ آباد، ۱۹۶۵ء، ص ۲۹۴۔ (۲۵) مآثرالکرام، ج ۲، ص ۵۸۶ بحوالہ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۴۵۔ شعرالعجم، ج ۳، ص ۳۳۔ (۲۶) بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۴۵۔ دربار اکبری، ص ۳۶۱۔ رود کوثر، ص ۱۰۱، اس وقت فیضی کی عمر ۲۱ سال تھی۔ (۲۷) دربار اکبری، ص ۳۶۰-۳۶۱۔ تذکرہ آزاد، ص ۴۳۔ غالب نامہ از شیخ محمد اکرام، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۳۴۶۔ (۲۸) بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۵۰۔ دربار اکبری، ص ۳۶۲۔ دربار اکبری اور شعرالعجم ج ۳ (ص ۳۵) میں ۹۹۶ھ درج ہے۔ قصیدے کے اشعار میں شبلی نے آخر شعر (از بہر صعود الخ) مطلع کے بعد نقل کیا ہے اور "فکرت ما" کی جگہ "فکرت من" لکھا ہے۔ (۲۹) دربار اکبری، ص ۳۶۱-۳۶۲۔ ریاض الشعراء، ص ۲۹۷۔ شعرالعجم، ج ۳ ص ۳۴، صباح الدین عبدالرحمن نے بحوالہ منتخب التواریخ (ج ۲، ص ۲۹۹) لکھا ہے کہ ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں فیضی دوآب یعنی ستلج اور بیانہ کے درمیانی حصہ کا صدر بنایا گیا۔ دیکھیے بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۳۹۔ (۳۰) اکبرنامہ، ج ۳، ص ۳۸۰-۴۰۴، بحوالہ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۴۹-۱۵۰، شعرالعجم، ج ۳، ص ۳۵۔ (۳۱) غبار خاطر مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، مکتوب ۱۶۔ (۳۲) اکبرنامہ، ج ۳، ص ۶۳۹، بحوالہ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۵۴۔ (۳۳) منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۲۶۸۔ اکبرنامہ، ج ۳، ص ۲۷۱، بحوالہ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۴۷۔ دربار اکبری، ص ۴۹۔ (۳۴) شعرالعجم، ج ۳، ص ۳۹۔ (۳۵) دربار اکبری، ص ۱۱۶۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۵۴۔ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۳۹۔ (۳۶) ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۵۲۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۰۔ دربار اکبری، ص ۱۱۵۔ شعرالعجم، ج ۳، ص ۵۵۔ (۳۷) شعرالعجم، ج ۳، ص ۵۵۔ آزاد نے دربار اکبری (ص ۳۷۶) میں مقصد الشعراء لکھا ہے۔ (۳۸) شعرالعجم، ج ۳، ص ۵۴۔ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۷۵۔ آزاد نے دربار اکبری میں لطیفۂ فیاضی لکھا ہے۔ (۳۹) منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۳۹۶ بحوالہ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ۔ پروموشن آف لرننگ از ڈاکٹر نریندر ناتھ لا، ص ۱۴۷۔ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۷۵۔ دربار اکبری، ص ۱۱۶۔ ماہنامہ آج کل (دہلی) بابت اپریل ۲۰۱۰ء میں "اکبر اعظم کی مصور رامائن اور خان خاناں کا

ذاتی نسخہ" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کے مصنف جلال الدین صاحب ہیں۔ اس مضمون میں مترجم کا نام نقیب خاں لکھا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی صراحت ہے کہ نقیب خاں نے یہ ترجمہ دیبی مصر برہمن کی مدد سے کیا تھا۔ دیبی مصر اشلوک کا سنسکرت سے ترجمہ کرتے جاتے تھے اور نقیب خاں فارسی میں تحریر کرتے تھے۔ مضمون نگار نے ترجمہ شدہ مصور نسخے کے سرورق کا عکس بھی دیا ہے۔ (۴۰) مآثر الامراء، ج ۲، ص ۵۸۷ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۴، ص ۱۰۱، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۲۰۰۸۔ حواشی تذکرہ از مالک رام، ص ۳۶۳۔ ریاض الشعراء، ص ۴۹۷۔ دربار اکبری، ص ۳۷۵۔ (۴۱) منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۳۹۳ بحوالہ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۵۵۔ رود کوثر، ص ۱۳۴۔ دربار اکبری، ص ۳۷۶۔ فیضی نے اپنی تحریر میں تقریظ کی جگہ توقیع لکھا ہے۔ (۴۲) رود کوثر، ص ۱۳۴۔ دربار اکبری، ص ۳۷۶۔ محمد حسین آزاد نے "تکوی" کے بجائے "نکلہ" لکھا ہے اور حاشیے میں وضاحت کی ہے کہ "نکلہ" لاہور میں ایک محلہ تھا۔ مولانا جمال الدین ان دنوں یہاں فاضل کامل تھا اس محلہ میں رہتے تھے۔ (۴۳) زبدۃ المقامات، نول کشور ایڈیشن، ص ۱۳۱-۱۳۲ بحوالہ رود کوثر، ص ۲۲۸۔ تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۴، ص ۱۳۶۔ (۴۴) A History of Sufism in India, Vol.II, P.197۔ (۴۵) ایضاً۔ (۴۶) ایضاً، ص ۲۴۔ (۴۷) دربار اکبری، ص ۳۷۶۔ شعر العجم، ج ۳، ص ۵۱۔ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۴۷۔ (۴۸) تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۴، ص ۹۹ تا ۱۰۲۔ (۴۹) منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۳۰۵ ومابعد بحوالہ شعر العجم، ج ۳، ص ۳۲۔ دربار اکبری، ص ۳۶۶۔ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۶۴۔ (۵۰) فارسی عبارت منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۳۰۵ ومابعد میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ۵۱) ایضاً۔ (۵۲) شعر العجم، ج ۳، ص ۳۹۔ (۵۳) دربار اکبری، ص ۳۸۵۔ شعر العجم، ج ۳، ص ۳۲۔ (۵۴) اردو ترجمہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن سے ماخوذ ہے۔ (۵۵) دربار اکبری، ص ۴۱۲۔ شعر العجم، ج ۳، ص ۴۰-۴۱۔ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۶۶۔ (۵۶) مآثر الامراء بحوالہ شعر العجم، ص ۴۰-۸۰۔ دربار اکبری، ص ۳۷۶۔ (۵۷) منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۳۰۲ ومابعد بحوالہ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۶۹۔ شعر العجم، ج ۳، ص ۴۳۔ (۵۸) شعر العجم، ج ۳، ص ۴۰-۴۱۔ فوائد سعدیہ از قاضی ارتضیٰ علی خاں گوپاموی۔ خلاصۃ التواریخ از مولانا فضل امام خیرآبادی۔ (۵۹) رود کوثر، ۳۵۸، ۳۵۹۔ (۶۰) ایضاً۔ (۶۱) تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۴، ص ۱۳۶۔ (۶۲) مبلغ الرجال، ورق ۴۳ الف۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ج ۴، ص ۱۱۴ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۴، ص ۹۸۔ (۶۳) رود کوثر، ص ۱۱۹، ۱۳۱۔ اکبر نے وحدت ادیان کے تصور پر مبنی جو نظام مرتب کرایا تھا اس کو "دین الٰہی" کا نام بعد میں انگریز مورخین نے دیا ہے۔ ابوالفضل اس کو "دین الٰہی" نہیں "آئین رہنمونی" کہتا ہے۔

سیرت نگاری کا جغرافیائی اسلوب

(بیسویں صدی کا ایک نیا رجحان)

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس*

سیرت نگاری ہر دور کا ایک زندہ موضوع ہے۔ زمان و مکان کے تغیرات کے ساتھ اس کی نئی نئی جہتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ کیونکہ سیرت ہر موڑ پر انسان کی رہنمائی کرتی ہے، اس لیے جیسے ہی احوال وظروف بدلتے ہیں سیرت النبی کا ان نئے احوال میں ایک نیا گوشہ سامنے آجاتا ہے۔ سیرت نگار اس گوشہ کو تحریری صورت میں رہنمائی کے لیے انسانوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ سیرت نگاری کا یہ وہ منفرد پہلو ہے جو عام سوانح عمریوں سے کہیں زیادہ منفرد، ہمہ گیر، جامع، انسانیت ساز اور انسانیت نواز ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیرت نگاری ایک عام انسان کے احوال و کمالات کا تذکرہ نہیں بلکہ ایک ایسے انسان کامل کے احوال و مقامات کی تفصیل ہے جو ختم نبوت کے منصب کے ساتھ تشریف لائے اور جن کی زندگی کا کوئی گوشہ مستور و مخصوص ہونے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ ہر آن اور ہر لحہ ہر انسان کے لیے مکمل نمونہ نظر آتا ہے۔

سیرت نگاری اپنے اندر دو پہلو رکھتی ہے: ایک دینی اور دوسرا تاریخی، مطالعہ سیرت اس لیے اہم وضروری ہے کہ آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنانے اور آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع کا حکم ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے سیرت نگاروں نے حیات مبارکہ کے مختلف لمحات کو اپنی سیرت کی کتابوں کی زینت بنایا۔ لیکن سیرت النبی کا دوسرا پہلو تاریخی واقعات وحقائق کا بیان ہے۔ اس تاریخی پہلو کو بھی محفوظ کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ احکامات رسول کے صحیح موقع محل کا تعین ہو سکے۔ ناسخ و منسوخ کے بارے میں معلومات مل سکیں اور غیر مسلموں کی غلط فہمیوں

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، پاکستان۔

کو دور کیا جاسکے۔ سیرت نگاری کے یہ دونوں پہلو ایک طرف مسلمانوں کی عقیدت میں اضافہ کرتے ہیں تو دوسری طرف غیر مسلموں کو پیغام نبوی کے حوالے سے حقیقت پسند ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔

بیسویں صدی میں جب ٹیکنالوجی نے حیرت انگیز ترقی کرلی تو سیرت نگاری کے حوالے سے عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے بھی اس ترقی سے مدد لی گئی۔ کیونکہ اس صدی میں تعلیم و تدریس کے اسالیب میں تنوع آیا اور سیرت نبوی کا تعلق بھی چونکہ تعلیم انسانیت سے ہے اس لیے سیرت نگاری کے نئے اسالیب متعارف ہوئے ان اسالیب میں سیرت نگاری کا تصویری رجغرافیائی اسلوب نہایت اہم ہے یہ اسلوب سیرت نگاری "تصویری تفسیر" کہلا سکتا ہے۔ سیرت نگاروں نے واقعات سیرت اور مقامات سیرت کے لیے متعلقہ مواد کو تصویر اور نقشوں کی مدد سے ظاہر کرنا شروع کر دیا تا کہ دینی اور تاریخی حوالے سے عقیدت کے بند معنوں کو مضبوط کیا جائے۔ سیرت نگاری کی اس نئی جہت کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں: "معلومات کی ترسیل میں بصری مواد اور تصاویر کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ جدید نفسیات دان اور ذرائع ابلاغ عامہ پر تحقیق کرنے والے دانشوروں کے مطابق اگر کسی کتاب، پمفلٹ یا بروشر پر عبارت اور تصاویر چھپی ہوں تو سب سے پہلے قاری کی توجہ تصویر ا سکیچ اور فوٹو گرافک مواد کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ کیپشن، عبارات اور منسلک تحریر کی طرف وہ بعد میں متوجہ ہوتا ہے" (۱) موصوف نے اس اسلوب کے علمی دنیا پر اثرات کو ان الفاظ میں بیان کیا: "سیرت طیبہ کی تحقیق و تفہیم کے ذیل میں ذرائع ابلاغ اور الیکٹرانک میڈیا کے وسائل سے استفادہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس سے نہ صرف مواد و معلومات کے بارے میں تیقن کی فضا پیدا ہوئی ہے بلکہ نئے قارئین کے مطالعہ سیرت میں بھی دلچسپی کے سامان مہیا ہو رہے ہیں"۔ (۲)

اردو سیرت نگاری میں اس اسلوب کو ابتدائی طور پر سرسید احمد خاں نے متعارف کروایا، اس کے بعد سیرت کی بیشتر کتابیں نقشہ جات و تصاویر سے مزین رہیں۔ ان سے پہلے اس موضوع پر ایوب پاشا صابری نے ترکی زبان میں کام کیا۔ لیکن زبان یار من ترکی کی وجہ سے یہ ہم تک نہ پہنچ سکی۔ اس کے بعد ڈاکٹر شوقی ابو الخلیل نے کام کیا جس کا ترجمہ ہو چکا ہے اس اسلوب کی افادیت و اہمیت کا اندازہ درج ذیل نکات سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱- سیرت النبیؐ کے تاریخی پہلو کی تفہیم اور تدریس کے لیے یہ اسلوب عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

۲- ان تاریخی مقامات کی ہیئت میں تبدیلی کا تدریجی ارتقاء سامنے آتا ہے۔

۳- نبی کریم ﷺ نے مختلف امور کے لیے جو منصوبہ بندی کی وہ ان نقشوں اور تصاویر کی وجہ سے بآسانی سمجھی جاسکتی ہے جیسا کہ الیاس عبدالغنی نے صحابہ کے مکانات کے حوالے سے لکھا ہے: ''سرکار رسالت مآب ﷺ نے مہاجر صحابہ کی آبادکاری کا جو منصوبہ بنایا تھا انشاء اللہ یہ کتاب اس کے خدوخال کی وضاحت میں معاون ثابت ہوگی''۔(۳)

تصاویر کے ذریعہ پیغام رسانی کے اس دور میں یقیناً سیرت النبی کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے یہ ایک بہترین رجحان ہے۔ مگر اس حوالے سے شائع ہونے والی کتب عام قاری کی پہنچ سے دور ہیں۔ کیونکہ اس اسلوب کی صحیح پیش کش کی طباعت پر بہت خرچ آتا ہے۔

بیسویں صدی میں اس رجحان کی چند نمایندہ کتب جو اردو زبان میں ہیں درج ذیل ہیں:

اٹلس سیرت نبوی ﷺ: اردو میں شائع ہونے والی یہ کتاب شام کے ڈاکٹر شوقی ابوخلیل کی تالیف اطلس السیرۃ النبویہ کا ترجمہ ہے۔ محسن فارانی نے توضیح و اضافہ کے عنوان سے اس میں بہت سی معلومات کا اضافہ کردیا ہے۔ اس کتاب کو کسی بھی زبان میں سیرت نگاری کے جغرافیائی اسلوب کی اولین کاوش قرار دیا جاسکتا ہے، جو کسی شکل میں اردودان طبقہ تک پہنچی۔ بقول شوقی ''یہ اٹلس صرف سیرت کی ایک کتاب ہی نہیں بلکہ مختلف نقشے اور تصاویر ہیں جو آپ کی سیرت کو محیط ہیں اگر مجھ سے پہلے کسی نے ایسا کام کیا ہے تو بہت اچھی بات ہے، اللہ تعالیٰ اس پر برکت نازل فرمائے، لیکن میں سمجھتا ہوں کسی شخص نے سیرت طیبہ کو اس طرح نقشوں کی مدد سے اول تا آخر پیش نہیں کیا''۔(۴) کتاب کے آغاز میں تقدیم کے عنوان سے سیرت النبی کے بعض اہم گوشوں اور پیغام نبوی کی چند اہم خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ بذات خود ایک دلچسپ، اچھوتا اور معلوماتی مضمون ہے۔ کتاب کے چند اہم نقشے درج ذیل ہیں:

۱- حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سفر کی تفصیلات کو نقشے کے ذریعے سمجھایا گیا ہے جس میں آپ علیہ السلام ''اُر'' سے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور مکہ مکرمہ تک یہ سفر مکمل ہوتا ہے، اضافی توضیحات

میں اس سفر کی تفصیلات اس طرح بتائی گئی ہیں۔

اُر سے بابل	۲۲۵	کلومیٹر
بابل سے حران	۹۰۰	کلومیٹر
حران سے حلب	۳۰۰	کلومیٹر
حلب سے القدس	۶۰۰	کلومیٹر
القدس سے الخلیل	۳۵	کلومیٹر
الخلیل سے مصر	۵۰۰	کلومیٹر
الخلیل سے مکہ مکرمہ	۱۴۵۰	کلومیٹر (۵)

یہ مسافت اور نقشہ دیکھ کر اس دور میں کیے گئے اس سفر کی مشکلات انسان کے سامنے آجاتی ہیں۔

۲-عربوں کے ۱۴ اصنام جن مقامات پر نصب تھے ان کو نقشے کے ذریعے سمجھایا گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان مقامات کے اردگرد کون کون سے قبائل تھے اور ان میں باہم فاصلہ کتنا تھا۔(۶)

۳-ہجرت حبشہ کے نقشے سے الشعیبہ، مصوع کے مقامات کی نشان دہی ہوتی ہے جن سے گذر کر مسلمان اکسوم پہنچے۔(۷)

۴-ہجرت نبوی کا نقشہ مقامات ہجرت نبوی کی نشان دہی کرتا ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اصل رستہ سے کس قدر ہٹ کر سفر کیا۔اس نقشہ کو دیکھ کر فوری طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ اس حکمت عملی کا کیا فائدہ ہوا۔(۸)

۵-مختلف غزوات کے نقشہ جات آپ ﷺ کی جنگی حکمت عملی کو واضح کرتے ہیں۔ان نقشوں کے ذریعے ایک فوجی اس دور میں اختیار کی گئی جنگی حکمت عملی کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔غزوہ خندق میں اس جگہ کو واضح کیا گیا۔ جہاں خندق کھودی گئی اور مختلف قبائل کے علاقہ جات کو دکھایا گیا، دشمن کے مختلف قبائل نے کن سمتوں سے حملہ کیا اس کو بھی واضح کردیا گیا ہے۔(۹)

۶-۹ھ کو عام الوفود کہا جاتا ہے۔اس سال مختلف علاقوں سے وفود بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے مولف نے ان وفود کی آمد کو نقشہ کے ذریعہ واضح کیا ہے(۱۰)۔جس سے اندازہ ہوتا

ہے کہ عرب کے تمام اطراف سے لوگ آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے۔

الغرض سیرت نبوی کے اس جغرافیائی اسلوب نے سیرت نگاری کو جونئی جہت عطا کردی ہے اس کتاب کے ذریعہ اسے پوری طرح واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے ادارہ نے جن چیزوں کو پیش نظر رکھا اس کا ذکر بھی اجمالاً کرنا مناسب ہے۔

۱- اطلس السیرۃ النبویہ (عربی) میں نبی ﷺ کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک ہجرت کا راستہ (طریق الہجرۃ) درست نہیں دکھایا گیا، چنانچہ اس کی جگہ ایک اور درست تر نقشہ شامل کیا گیا ہے۔

۲- جزیرہ نمائے عرب کی جدید سیاسی تقسیم کے حوالے سے ایک نقشہ شروع میں دے دیا گیا ہے۔

۳- حرم مکی اور مسجد نبوی کی رقبوں میں مختلف زمانوں میں ہونے والی توسیعات کو واضح کرنے کے لیے دو نئے رنگین نقشے پیش کیے گئے ہیں۔ (۱۱)

ارض نشانات نبوی ﷺ: شاہ مصباح الدین شکیل کی مرتب کردہ اس کتاب کے کل صفحات ۳۴۸ ہیں۔ حسن طباعت اور تصویری معلومات کی تفصیلات کے حوالے سے سیرت نگاری کے جغرافیائی رجحان میں یہ کتاب بہت اہم ہے۔ ''سیرت نبویؐ کے موضوع پر یہ ان کی نصف صدی پر محیط شبانہ روز ریاضت کا ثمر ہے۔ وقائع سیرت کے حوالے سے نثری تفصیلات کے ساتھ جہاں بھی ممکن ہوا ایسی تصویریں اور نقشے فراہم کردیے گئے ہیں جن کی موجودگی میں فہم سیرت کا ایک ایسا دریچہ وا ہو جاتا ہے جو قاری یا ناظر کے مستند معلومات کا خزانہ پیش کرتا ہے۔ آئینہ ماہ و سال کے ساتھ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مقدس خانوادے کی پاکیزہ سرگرمیوں کی تفصیل فراہم کی گئی ہے، حجاز کی اس مقدس وادی کا حسن اس وقت کمال کو پہنچ گیا جب قریش کے معزز قبیلے میں نبی اکرم محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی اور پھر آپ ﷺ کی طفولیت، جوانی، غار حرا کی خلوتوں میں ذوق عبادت، اسراء و معراج، راہ ہجرت، غار ثور، مدینۃ النبی میں آمد سے قبل قباء میں تعمیر مسجد اور اس کی تفصیلات، غزوات کے میدان، جنت المعلی اور جنت البقیع کے آسودۂ خاک خوش نصیب مکینوں کے احوال، مملکت سعودی عرب کی تشکیل اور آثار نبوت نیز خلافت عثمانیہ میں توپ قاپی کے عجائب گھر کے مقدس نوادرات اور دیگر یقین افروز تفصیلات کی

تصاویر اس تصنیف لطیف کے حسن و جمال کی آئینہ دار ہیں''۔(۱۲)

کتاب کے مطالعہ سے قاری کے سامنے عہد نبوی کی تصاویر گھومنے لگتی ہیں اور وہ ان کی مدد سے تصورات و خیالات میں عہد نبوی کا باسی بن جاتا ہے۔ ہر صفحہ پر نعتیہ اشعار کا درج کرنا مصنف کے جذبہ دروں کا مظہر ہے۔ صرف تصاویر کا سہارا نہیں لیا گیا ان کی وضاحت و توضیح کے لیے مستند و معتبر کتب سیرت کے حوالہ جات بھی دیے گئے ہیں۔ مختلف نقشہ جات حدود اربعہ سمجھنے میں انتہائی ممد و معاون ہیں۔ جن کی مدد سے تاریخ عرب اور خصوصاً اسناد نبوی اور غزوات کا محل وقوع و نوعیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ محقق کے ذوق تحقیق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے ہر عنوان کے ساتھ مناسبت رکھنے والی آیت اور حدیث کو نقل کیا ہے۔ مثلاً جنات کا ایمان لانا کے عنوان کے بعد سورۃ الذاریات کی آیت:۵۶/اور صحیح مسلم کتاب قتل الحیات سے حدیث نقل کی گئی ہے(۱۳)۔ مدینۃ النبی کے عنوان کے بعد سورۃ الاسرا کی آیت:۸۰/اور صحیحین سے حدیث نقل کی ہے(۱۴)۔ ہر صفحہ کے ڈیزائن اور رنگوں کی ترتیب آنکھوں کو فرحت بخشتی ہے۔ اس کتاب کے غزوات کے نقشہ جات بہت اہم ہیں۔

جغرافیائی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیں تو ہر عنوان کو تصویر، نقشہ یا خاکہ کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اس بات کا اہتمام بھی کیا ہے کہ بتایا جائے یہ تصویر یا خاکہ کس دور کا ہے۔ اس اسلوب سے عمارات اور شاہراہوں میں ہونے والی تدریجی تبدیلیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مثلاً ابواب مسجد نبوی کے عنوان کے تحت مصنف نے درج ذیل تفصیلات دی ہیں:

عنوان کے معاً بعد ابواب کا خاکہ دیا ہے اور ہر باب کی وضاحت کی ہے کہ یہ اس وقت موجود ہے یا نہیں جیسے قدیم باب عمر بن خطابؓ (موجود ہے)، جدید باب عمر بن خطابؓ، اس خاکہ کے نیچے مصنف نے لکھا ہے ''مسجد نبوی ۲۰۰۵ء کے مطابق دروازوں کی تفصیل''۔ اس کے بعد ص ۲۲۱-۲۳۲ تک مختلف جدید و قدیم تصاویر اور ان کے بارے میں معلومات درج ہیں۔ ص ۲۲۱ سے ان ابواب کی تفصیلات شروع ہوتی ہیں۔ نیچے حفیظ تائب کا یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

ہر باب مسجد نبوی ہے در مراد		ہر زاویے سے اس حرم دلکشا کی خیر

ابواب کی تفصیلات کے بعد مینار کا ذکر ہے اور اس ضمن میں مولف نے قدیم معروف

مساجد کے میناروں کی تصاویر دیکھ کر شاید مسجد نبوی کے میناروں کی دلفریبی اور دل کو موہ لینے کی تاثیر کو تصویروں کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ دور رسالت مآب ﷺ میں سفارتی تعلقات پر ایک خوبصورت نقشہ جس میں ان علاقوں کی نشان دہی بھی کی گئی جہاں آپ ﷺ نے سفیر روانہ کیے اور ان علاقوں کو بھی واضح کیا گیا جہاں سے سفیر آپ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے۔ اس طرح اس مختصر نقشہ نے سفارتی تعلقات جیسے وسیع عنوان کو چند سطروں میں واضح کر دیا۔

۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء کو نبی اطہر ﷺ کا جسد اطہر چرانے کی ناپاک کوشش کی گئی۔ فاضل مولف نے مسجد نبوی کی توسیع کے دوران کھدائیوں میں برآمد ہونے والی وہ سرنگ جو عیسائی راہبوں نے بنائی تھی، کی تصویر بھی دی ہے۔ دوسری تصویر میں سرنگ کی لمبائی اور چوڑائی ظاہر ہوتی ہے۔ گویا یہ تصاویر ایک خفیہ سازش کی شہادت ہیں جس کو دیکھ کر کوئی بھی اس سازش کا انکار نہیں کر سکتا۔ آخر میں مولف نے ترکی کے توپ قاپی سرائے محل (عجائب گھر) کے قیام کا پس منظر اور اس میں پڑے ہوئے آثار انبیاء و صحابہ کرام کی نادر و نایاب تصاویر دی ہیں، چودہ سو سولہ مصحف عثمانی کی تصویر بھی ان میں شامل ہے۔

نقوش پائے مصطفیٰ ﷺ: ابو محمد عبد المالک کی یہ تصنیف بنیادی طور پر آثار سیرت النبی ﷺ کی تصاویر پر مشتمل ہے۔ مصنف اس کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں "یوں یہ کتاب جغرافیہ سیرت اور احوال سیرت دونوں کا مجموعہ ہے اجمالی طور پر کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

حیات سعیدہ کے پہلے چالیس سال: اس حصہ میں مکی زندگی کے قبل از نبوت احوال کا بیان ہے۔

نبوت کے پہلے ۱۳ سال: اس حصہ میں بعد از نبوت مکی زندگی کے ۱۳ سالہ حالات کا تذکرہ ہے۔

مدینہ منورہ کے شب و روز: اس عنوان کے تحت مدینہ طیبہ کے ۱۰ سال لحات حیات سعیدہ کا تذکرہ۔

مدینہ منورہ میں آثار نبوی: اس میں آقا ﷺ سے منسوب مدینہ طیبہ کے آثار و یادگار مقامات کا تعارف اور آخر میں سفر آخرت و مرض الوفات کا بیان ہے۔(۱۵)

مصنف نے ''آثار کی تعیین اور راہنمائی کے لیے کتابوں اور نقشوں سے مدد لی، وہاں مقیم علمائے کرام اور مقامی لوگوں سے بھی معلومات لیں، کوشش کی کہ مبارک قدم جہاں جہاں پڑے ان تک رسائی ہو'' کیوں کہ ''محبوب ﷺ کے آثار و یادگار مقامات دیکھ کر محبت و عقیدت میں اضافہ ہوتا ہے''۔ (۱۶)

کتاب کی ابتداء میں ''صحابہ و تابعین کی آثار رسول ﷺ سے محبت و عقیدت کے عنوان سے ایک مضمون ہے، یہ مضمون اسلاف کی آثار نبوی سے عقیدتوں اور محبتوں کا مظہر ہے۔ مصنف کی یہ کتاب اس موضوع پر اردو میں لکھی جانے والی کتابوں میں متاخر شمار ہوتی ہے، نئی تصاویر کم ہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ مصنف ان کے حصول کے لیے تین ماہ تک حرمین شریفین میں مقیم رہے۔ چند اہم تصاویر درج ذیل ہیں۔

سوق عکاظ کے کھنڈرات۔ بیت خدیجہؓ۔ سیدہ ام ہانیؓ کے گھر کی نشان دہی۔ ۱۳۷۱ھ میں کعبہ کی لی گئی تصویر۔

جستجوئے مدینہ: جغرافیائی سیرت کی نمائندہ سب سے ضخیم کتاب کے لیے عبدالحمید قادری نے تحقیق کی ہے۔ مصنف نے کتاب کے آخر میں اپنے مآخذ کی نشان دہی بھی کی ہے جس میں ۸۱/عربی کی، ۸۰/اردو اور ۴۱/انگلش کی کتب ہیں، یہ کتاب ۲۵/ابواب پر مشتمل ہے۔ چند ابواب درج ذیل ہیں۔

باب ۵: ارض طیبہ کے جغرافیائی اور ارضیاتی خد و خال اور خصائص اور وہاں کے عمرانی ارتقاء پر ایک طائرانہ نظر۔ باب ۸: مدینہ طیبہ کی سیاسی اہمیت۔ باب ۹: مدینہ طیبہ میں تجارتی سرگرمیوں کا تاریخی جائزہ۔ باب ۱۲: امہات المومنینؓ کے حجرات مبارکہ۔ باب ۱۳: تبرکات نبویہ الشریفہ اور آثار مدینہ طیبہ۔ باب ۱۴: مسجد نبوی شریف۔ باب ۱۸: مقام صفہ اور اصحاب الصفہ رضوان اللہ علیہم۔ باب ۲۰: مدینہ طیبہ میں تاریخی کنویں اور آب رسانی۔ باب ۲۳: ماضی میں مدینہ طیبہ میں موجود صوفیانہ خانقاہیں اور زاویے۔ باب ۲۴: مدینہ طیبہ کے کوہسار۔ آخری باب: متفرق معلومات کا حامل ہے۔

یہ کتاب اپنی تاریخی معلومات کی وجہ سے منفرد مقام رکھتی ہے مولف سیرت النبی کے

مدنی دور کا تاریخی اور جغرافیائی جائزہ نقشہ جات اور تصاویر کے ذریعہ لیا ہے۔ جدید و قدیم مدینہ منورہ میں تاریخی فرق اس کتاب کے ذریعے صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

تالیفات عبدالغنی: ڈاکٹر محمد الیاس عبدالغنی نے اس اسلوب سیرت نگاری پر تین کتابیں تحریر کی ہیں۔

۱- تاریخ مکہ مکرمہ۔

۲- تاریخ مدینہ منورہ۔

۳- مسجد نبوی شریف کے پاس صحابہ کے مکانات۔

ان کتب کو عربی سے ترجمہ کیا گیا ہے، ان میں بھی سابقہ کتابوں کی طرح تصاویر اور نقشہ جات کی مدد سے نقوش سیرت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (۱۸)

یہ چند کتب کا اجمالی تعارف ہے۔ ان کتب کی کسی ایک موضوع پر تصاویر اور نقشہ سیرت کی وجہ سے آسانی بھی ہوگی اور روح وقلب کی تازگی کا سامان بھی فراہم ہوگا۔ سمعی وبصری معاونات کی مدد سے تعلیم وتدریس کے اس دور میں یہ اسلوب سیرت نگاری اور تفہیم سیرت کے نئے گوشوں کو آشکار کرتا ہے۔

حوالہ جات

(۱) ریاض مجید، ڈاکٹر، نشانات ارض نبوی ایک مطالعہ مشمولہ نشانات ارض نبوی از شاہ مصباح الدین شکیل، فضلی سنز لمیٹڈ کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۔ (۲) ایضاً، ص ۱۱۔ (۳) عبدالغنی، ڈاکٹر محمد الیاس، مسجد نبوی کے پاس صحابہ کے مکانات، مطابع الرشید مدینہ منورہ، ۲۰۰۳ء، ص ۹۔ (۴) شوقی ابوخلیل، ڈاکٹر، اٹلس سیرت نبوی، دارالسلام ریاض، ۱۴۲۴ھ، ص ۲۵-۲۶۔ (۵) ایضاً، ص ۴۳۔ (۶) ایضاً، ص ۵۸۔ (۷) ایضاً، ص ۱۲۱۔ (۸) ایضاً، ص ۱۴۹۔ (۹) ایضاً، ص ۲۸۱۔ (۱۰) ایضاً، ص ۳۴۷۔ (۱۱) ایضاً، ص ۱۳۔ (۱۲) نشانات ارض نبوی، ص ۴۔ (۱۳) ایضاً، ۱۲۷۔ (۱۴) ایضاً، ص ۱۷۱۔ (۱۵) ابومحمد عبدالمالک، نقوش پائے مصطفی ﷺ، مکتبہ العرب للطباعت کراچی، ص ۱۵۔ (۱۶) ایضاً۔ (۱۷) یہ کتاب اورینٹل پبلی کیشنز پاکستان، لاہور سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی ہے اور ۹۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ (۱۸) ان کتب کے ترجمے سعودی عرب سے شائع کروائے گئے ہیں۔

تفسیر ”ترجمان القرآن“ پر چند اشکالات

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

ایک آدمی قندھار سے پیدل چل کر رانچی پہنچتا ہے اور مولانا آزادؒ سے قرآن کے چند مقامات کی تفہیم سے تشفی حاصل کرکے اچانک واپس چلا جاتا ہے۔ وہ ”الہلال“ اور ”البلاغ“ کے قرآنی افادات سے مکمل طور پر فیض اٹھا چکا ہے۔ مولانا آزادؒ اس کے نام تک سے واقف نہیں ہوسکے لیکن انہوں نے ”ترجمان القرآن“ کو اس نامعلوم شخص کے نام منسوب کیا ہے۔ حکیم فضل الرحمٰن سواتی کے ایک مقالہ مشمولہ ”برہان“ (دہلی) شمارہ دسمبر ۱۹۵۹ء سے معلوم ہوا کہ یہ حضرت مولانا دین محمد قندھاری تھے(۱)۔ ایک شخص جو خود فاضل علوم اسلامیہ ہو اور الہلال اور البلاغ کے تفسیری افادات سے مکمل طور سے فیض یاب ہو چکا ہو وہ جس سے معارف قرآنی کی سمجھنے کی تڑپ لے کر اتنی دور پیدل چل کر آیا ہو اس کا علوم قرآنی میں کیا مرتبہ ہوگا؟

مولانا ابوالکلام آزاد(۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) کی شخصیت نابغہ روزگار تھی۔ وہ بیک وقت مفسر، محدث، مفکر، صحافی، دانشور اور دیگر علوم وفنون میں اجتہادی بصیرت کے حامل، علوم دینیہ وعصریہ کا ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھے۔ سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا کے سلسلہ فکر کی وہ ہندوستان میں نمود تھے۔ تمام علوم پر دسترس رکھنے اور علامہ ابن تیمیہؒ سے متاثر شاہ ولی اللہؒ کی میراث کے حامل اور اسے عملی طور سے اپنی تحریروں کے ذریعے ہندوستان میں روشناس کرانے والے گذشتہ صدی کے وہ ممتاز فرد تھے۔ ان کے ذہن میں ملت اسلامیہ کی تعمیر نو کا ایک منظم خاکہ تھا جس میں رنگ آمیزی کے دوران ہی بقول مولانا محمد علی قصوری، گاندھی اور نہرو نے انہیں اچک لیا اور اس طرح ان کی عملی شاہراہ ہی بدل گئی۔(۲)

بی-۱۰۴، بدر منزل، پٹیل نگر، وی پی ناکا، بھیونڈی(تھانے)۴۲۱۳۰۲۔

وزارت میں آنے سے قبل مولانا کی پوری زندگی زبان اور قلم سے ملک اور قوم کی خدمت میں گزری۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ۱۳ سے ۱۸ سال کے درمیان صحافتی مضامین کے علاوہ ان کی ۱۴ تصانیف کا ذکر کیا ہے جس میں ترتیب و ترجمہ بھی شامل ہیں۔ ۱۸ سال کے بعد کی مستقل تصانیف کی فہرست ۱۷ تک پہنچتی ہے جن میں سے بعض ناتمام رہ گئیں (۳)۔ ان میں "تذکرہ"، "غبار خاطر"، "مسئلہ خلافت" اور "تفسیر ترجمان القرآن" اہم ترین ہیں۔ اور ترجمان القرآن کی تو وہ اہمیت ہے کہ اگر مولانا اسی کو مکمل کر گئے ہوتے تو گویا یہ ملت اسلامیہ پر ایک عظیم احسان اور ان کے لیے توشۂ آخرت ہے۔

تدوین "ترجمان القرآن" کی تاریخ بہت دل خراش ہے۔ مولانا نے اس کی اشاعت اول اور اشاعت ثانی کے دیباچوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ تلف شدہ مسودوں کو دوبارہ قلم بند کرنے کی ذہنی اور قلمی صعوبتوں سے وہی شخص واقف ہوسکتا ہے جو اس مرحلہ سے خود گزر چکا ہو۔ ترجمان القرآن کا جس قدر حصہ شائع ہو چکا ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً تفسیر سورۃ الفاتحہ وہی چیز ہے جسے مولانا "تفسیر البیان" کے مقدمہ کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ "البیان" کا بیان صرف کاغذ تک محدود ہے لیکن عامۃ الناس کے استفادہ کے لیے ان کی تفسیر ترجمان القرآن (الفاتحہ تا النور) ہمارے سامنے موجود ہے۔ (۴)

مولانا آزاد کے تفسیری مباحث پر ہندو پاک میں اتنا کام ہو چکا ہے کہ اس پر مزید اضافہ اسی وقت سودمند ہوسکتا ہے جب کوئی نئی بات پیش کی جائے۔ پاکستان میں مولانا غلام رسول مہر نے تنہا ایک ادارہ کا کام کیا ہے۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے مولانا آزاد صدی کی تقریب میں ۱۹۸۸-۸۹ء میں ایک جنوبی ایشیائی سمینار کا انعقاد کیا تھا جس کے دس مقالات کو لائبریری کے ڈائرکٹر عابد رضا بیدار صاحب نے کتابی شکل میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے سات مضامین مولانا آزاد کی تحسین مفرط میں ہیں، ایک مضمون تنقید میں ہے اور دو مضامین منکرین حدیث کے ہیں جن میں سے ایک نے تفسیر میں محض چند احادیث سے استدلال کرنے پر مولانا کو مقلد کا خطاب دیا ہے اور دوسرے نے مولانا کے چند قابل تنقید مباحث کو مدار بناتے ہوئے ان کی اور علامہ مشرقی کی تحسین کی ہے۔

تحسین واعتراف کے ان حالات میں ہیچمداں کے لیے یہ امر سخت گراں تھا کہ ان تمام افکار و آراء سے استفادہ کرتا۔ بنا بریں یہ عاجز مولانا کے اسلوب نگارش اور مواد تفسیر پر مختصراً اپنی پراگندہ فکری کا اظہار کرے گا۔

مولانا نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کی ابتدا میں اصول تفسیر پر بارہ نکات تحریر فرمائے ہیں اور امام رازی پر سخت ترین نیز بیضاوی اور جلال الدین سیوطی پر نرم الفاظ میں تنقید فرمائی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا آزاد سے پہلے اصول تفسیر پر اردو میں عموماً کام نہیں ہوا لیکن ان کے بزرگ معاصر مولانا حمید الدین فراہیؒ نے تو اس موضوع پر خاصہ کام کیا ہے جسے "تدبر قرآن" کے نام سے ان کے نامور شاگرد مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے کچھ اپنے ایرادات اور اضافوں کے ساتھ مدون کر کے شائع کیا ہے (۵)۔ جو قرآن فہمی کے لیے اچھی بنیاد فراہم کرتا ہے، تدبر قرآن کے علاوہ انہوں نے اپنی مفصل تفسیر تدبر قرآن (۹ مجلدات) کی ابتداء ہی میں اصول تفسیر پر ایک وقیع مقدمہ تحریر فرمایا ہے (۶)۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے تفسیر "تفہیم القرآن" (۶ مجلدات) کے شروع میں ایک مقدمہ شامل کیا ہے جس میں تفسیر کے کچھ اصولوں کا بیان ہے (۷)۔ مولاناؒ کے معاصرین شیخ الہندؒ اور صاحب "بیان القرآن" مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کے یہاں اصول تفسیر پر کچھ مواد نہیں ہے۔ مولانا آزاد نے اصول تفسیر کے علاوہ ہر سورہ کی ابتداء میں ایک تعارفی دیباچہ لکھنے کا عندیہ دیا تھا۔ افسوس کہ ان کی مصروفیات اور موانع نے اس کی اجازت اور عمر نے اس کی مہلت نہیں دی۔ مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی دونوں نے یہ کام انجام دیا ہے۔ اس سے سورہ کے عمود اور اس کے مطالب کو صحیح طور سے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

اصول تفسیر دراصل علوم القرآن کی ایک شاخ ہے۔ متقدمین اور متوسطین میں اصول تفسیر نیز علوم القرآن پر کم از کم پندرہ امہات کتب کی نشان دہی کی گئی ہے (۸)۔ جن میں امام راغب اصفہانی، علامہ ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، الغزالیؒ، سیوطیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور نواب صدیق حسن خاںؒ کے علاوہ رافعیؒ اور زرقانیؒ کی تصنیفات سرفہرست ہیں۔ دور حاضر میں علامہ محمد حسین الذہبی نے "التفسیر والمفسرون" نامی کتاب لکھ کر قارئین کو دیگر کتب سے تقریباً بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کتاب کو مع حک و اضافہ کے مولانا غلام احمد حریری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے جو اردو دانوں کے لیے

ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔(۹)

اصول تفسیر اور مفسرین کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفاسیر کا انداز ذوقی ہوتا ہے۔ تفاسیر کی بالعموم دو قسمیں کی گئی ہیں: تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے۔ تفسیر بالماثور کا نمونہ جامع البیان فی تفسیر القرآن از ابن جریر طبریؒ اور تفسیر القرآن العظیم لابن کثیرؒ ہیں۔ متاخرین میں قاضی محمد علی شوکانی کی تفسیر فتح القدیر کو بھی اس میں شامل کیا جاتا ہے۔ تفسیر بالرائے کی بھی دو قسمیں کی گئی ہیں: تفسیر بالرائے الصالح اور تفسیر بالرائے الفاسد۔ امام رازی کی تفسیر مفاتیح الغیب، جس پر نہ صرف مولانا آزاد کو سب سے زیادہ اعتراض ہے بلکہ حاجی خلیفہ تک نے لکھا ہے کہ اس میں سب کچھ ہے الا تفسیر کے (۱۰)، تفسیر بالرائے الصالح کے ذیل میں آتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس تفسیر میں ربط آیات وسور ہے، ریاضی اور فلسفہ ہے، علم فقہ اور اصول نحو و بلاغت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس وقت کے سب سے بڑے کلامی فرقہ معتزلہ کا رد ہے۔ اگر مولانا آزاد اس تفسیر کا رد فرماتے ہیں تو پھر ان کے تمام تفسیری حواشی جو اپنی ضخامت میں اصل تفسیر سے کہیں زیادہ ہیں کس خانے میں رکھے جائیں گے؟ ؏ ایں گناہیست کہ در شہر شانیز کنند۔

جہاں تک بیضاوی کی انوار التنزیل واسرار التاویل کا تعلق ہے یہ تفسیر اور تاویل دونوں کی جامع ہے۔ یہ عربی زبان کے قواعد اور اہل سنت کے اصول وضوابط پر مشتمل ہے۔ مصنف، صاحب کشاف (علامہ جار اللہ زمخشریؒ) کے معتزلی عقائد سے بھی متاثر نظر آتے ہیں (۱۱)۔ اس تفسیر کی شیخ مخلوف نے بدر المنیر میں تعریف کی ہے (۱۲) اور حاجی خلیفہ نے بھی کشف الظنون میں اچھی رائے دی ہے۔ اسی لیے یہ کتاب علماء کی توجہ کا مرکز بنی اور اس پر حاشیے دیے گئے۔ مائل بہ اعتزال ہونے کے علاوہ اس پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سورتوں کے آخر میں جو احادیث ذکر کی گئی ہیں ان کی ثقاہت پر کلام نہیں کیا گیا ہے۔

جہاں تک تفسیر جلالین کا تعلق ہے یہ جلال الدین محلیؒ اور جلال الدین سیوطیؒ کی مشترک تصنیف ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا حصہ کس نے لکھا ہے۔ لیکن یہ تفسیر اس قدر مختصر ہے کہ اسے صرف تفسیری حاشیہ کہا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ترجمان القرآن بھی سورۃ الفاتحہ کے بعد تقریباً تمام ہی ایک تفسیری حاشیہ کی صورت رکھتی ہے۔ بیضاوی اور جلالین کا مولانا نے نام غالباً

اس لیے لیا ہے کہ درس نظامیہ کے پرانے نصاب میں عالمیت کے کورس میں جلالین اور فضیلت کے کورس میں بیضاوی کے کچھ اجزاء زیر درس رہا کرتے تھے۔

مولانا نے فرمایا ہے کہ تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں سے لغزشیں ہوئی ہیں (تفسیر بالرائے) سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا کہتی ہے (۱۳)۔ مولانا نے تفسیر بالرائے کی بالکل صحیح تفسیر بیان کی ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، اعتزال ایک فکری تحریک کی شکل میں حملہ آور ہوا تھا اور اگر امام رازی نے اس کے خلاف بند باندھنے کی کوشش کی تو اس میں کیا غلطی تھی؟ ہاں! بعض غیر ضروری اطنابات پر مولانا کا اعتراض اگرچہ درست ہے لیکن یہ اعتراض کوئی نیا تو نہیں ہے۔ البتہ بیضاوی، صاحب کشاف سے ضرور کچھ متاثر تھے۔

مولانا نے تفسیر بالرائے کی مزید شرح میں اس کے کچھ مذاہب کی نشان دہی کی ہے جیسے: مذاہب کلامیہ، مذاہب فقہیہ، مذاہب صوفیہ، مذاہب منطقیہ و نجوم و سائنس وغیرہ (۱۴)۔ ناچیز نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب پھر اس کی تکرار کرتا ہے کہ تفاسیر ذوقی ہوتی ہیں۔ غلام احمد حریری صاحب نے اپنی تاریخ تفسیر و مفسرین میں چھ اقسام کی تفاسیر کی نشان دہی کی ہے: فقہی، ادبی، تاریخی، نحوی، لغوی اور کلامی (۱۵)۔ اردو زبان میں موجود متداول تفاسیر کو بھی ہم اسی ذیل میں شمار کر سکتے ہیں۔ مولانا مودودی کی دعوتی تفسیر تفہیم القرآن نے اس پر ایک مزید قسم کا اضافہ کیا ہے۔ جہاں تک ترجمان القرآن کے جزو اول (تفسیر سورہ فاتحہ) کا تعلق ہے، یہ تفسیر قرآن بالقرآن کا اردو زبان میں ایک نمونہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اسے علمی اور عصری تحقیقات کا نمونہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ القرآن یفسر بعضہ بعضا کے تحت کئی مفسرین نے قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کرنے کی کوشش کی ہے جن میں سے ایک مولانا ثناء اللہ امرت سریؒ ہیں جن کی تفسیر عربی زبان میں تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن مطبوع ہے۔ دوسری تفسیر منکر حدیث مولوی عبداللہ چکڑالوی کی اردو زبان میں تفسیر القرآن بالقرآن کے نام سے ہے جس کی دو جلدیں خاکسار کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ سورہ فاتحہ کی ایک مفصل تفسیر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے بھی تحریر فرمائی ہے جو خاکسار کی نظروں سے گزر چکی ہے۔ اس میں مولانا آزاد کے بعض قابل اعتراض

افکار پر تنقید بھی شامل ہے۔ یہ تفسیر، تفسیر بالماثور کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ لیکن اس کی زبان پر مقامیت غالب ہے۔

ترجمہ قرآن ایک بہت مشکل امر ہے۔ لوگوں نے فن ترجمہ پر کتابیں لکھی ہیں اس موضوع پر خاکسار کا بھی ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے (۱۶)۔ مولانا آزاد نے قرآن کریم کا ترجمہ لفظی با محاورہ کیا ہے لیکن بعض دیگر مترجمین کے برخلاف یہ تشریحی ترجمہ نہیں بلکہ تفسیری ترجمہ ہے۔ خود لکھتے ہیں: قرآن کا ترجمہ اردو میں اس طرح مرتب ہو جائے کہ اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ رہے۔ اپنی تشریحات خود اپنے ساتھ رکھتا ہو۔ پھر جابجا نوٹوں کا اضافہ کیا ہے جو سورت کے مطالب کی رفتار کے ساتھ ساتھ برابر چلے جاتے ہیں۔ (۱۷)

مولانا نے سورہ فاتحہ کے بعد کی تین جلدوں میں اسی اصول ترجمہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس ترجمہ کی اصل خوبی یہ ہے کہ ترجمہ مطلق اور مع التفسیر دونوں اپنی اپنی جگہ نحوی طور سے مکمل ہیں۔ تفسیری ترجمہ کرنے کی وجہ سے مولانا کو تفسیری نوٹ لکھنے کی ضرورت بعد میں بہت کم پیش آئی ہے۔ لیکن اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مولانا سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بیشتر آیات کی اتنی تفصیل بیان کر چکے تھے کہ آیات کے محل اور سیاق وسباق میں ان کے پاس کہنے کے لیے بہت کم بچا تھا۔

جب مولانا نے قدمائے مفسرین کی طول بیانیوں پر اعتراض کیا ہے تو ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کے تفسیری حواشی اور نوٹس کو کیا کہا جائے گا؟ آیا انہیں تفسیر کی صف میں جگہ دی جائے گی یا تحقیق کی صف میں۔ یہ وہ نکتہ ہے جس پر ابھی تک غور نہیں ہوا ہے۔ مولانا کے اکثر طویل تحقیقی نوٹس کو بعد کے مفسرین نے کہیں من وعن اور کہیں جزوی طور سے قبول کیا ہے اس لیے ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ لیکن ان نوٹس کو اگر کتاب سے خارج کر دیا جائے تو کیا فہم قرآن میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی؟ یہ وہ سوال ہے جس کے حل ہونے پر تفسیر اور تحقیق کا فرق واضح ہو سکتا ہے۔

مولانا آزاد کی تفسیر پر ایک نظر ڈالنے سے قبل قرین حال معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انداز تحریر پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ مولانا کے پاس علوم دینیہ اور علوم عصریہ کا جو موسوعی (encyclopaedic) ذخیرہ تھا اس کا مولانا کو خود شدت سے احساس تھا اور اس احساس نے انکسار کے بجائے ان کے

اندر دو خصوصیات پیدا کردی تھیں: ایک ادعائیت اور دوسری نحنویت۔

ادعائیت کی مثال میں مولانا کی دو مختصر عبارتیں پیش ہیں: ''اب دیکھو! ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہو رہی ہے اور دوسری زیر طبع ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کی راہ سے وقت کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہوگئی ہے'' (۱۸)۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''...... لیکن اب کہ توفیق الٰہی سے ترجمان القرآن مکمل ہو کر شائع ہو رہا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے تمام دروازے کھل رہے ہیں جو ہماری کوتاہی عمل سے اس وقت تک بند تھے''۔ (۱۹)

مولانا کے اس انداز بیان کا شکوہ تو ان کے سب سے بڑے رفیق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی کیا ہے۔ پہلی واقفیت کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''میں الہلال پڑھتا رہا۔ چھٹیوں میں لکھنؤ سے گھر آتا تو والد کو بھی سناتا۔ مگر جلد ہی الہلال کے اڈیٹر سے ایک طرح کی جلن مجھ میں پیدا ہوگئی۔ مولانا کی تحریروں میں پیغمبرانہ انداز تھا۔ وہ بہت ''دون'' کی لیتے تھے اور میں جل جل جاتا تھا۔ آخر ایک دن والد سے کہہ دیا: معلوم ہوتا ہے یہ شخص پیغمبر یا مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے والا ہے اور میں اس شخص کا سب سے پہلا مخالف بنوں گا چاہے جان ہی دینا پڑے''۔ (۲۰)

مذکورہ صفت نمبر ۲ کے تحت عرض ہے کہ مولانا نے اپنی تحریروں میں مخاطب کو کبھی بھی ضمیر ''آپ'' سے خطاب نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ''تم'' ہی کہا۔ ترجمان القرآن کو چھوڑ دیجیے جہاں انہوں نے اکثر ازراہ انکسار خود کو کلمہ ''میں'' سے خطاب کیا ہے، ان کی تمام تحریریں پڑھ جائیے۔ ہمیشہ انہوں نے اپنے لیے ''ہم'' کی ضمیر استعمال کی ہے۔ لوگ ''انانیت'' کو ایک مرض قرار دیتے ہیں لیکن عاجز کا کہنا ہے کہ مولانا کے اندر ''انانیت'' نہیں بلکہ ''نحنویت'' تھی۔ اس کی مثال میں درج ذیل واقعہ پیش ہے:

راقم الحروف کے استاذ مولانا محمد عثمان جعفریؒ راوی ہیں کہ جب وہ حیدرآباد میں فوقانی درجات کے طالب علم تھے تو ایک دن ان کی درس گاہ میں علامہ شبلیؒ، علامہ سید رشید رضا کو ساتھ لے کر آئے۔ علامہ شبلی نے اردو زبان میں ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ تقریر فرمائی جس میں علوم و

معارف کے دریا بہا دیے۔ اس زمانہ میں دینی درس گاہوں میں عربی ذریعہ تعلیم نہیں تھی نہ ہی اساتذہ اور طلبہ میں عربی میں گفتگو یا تقریر کی مشق تھی، اس لیے جب علامہ شبلی نے فرمائش کی کہ ان کی تقریر کا کوئی صاحب عربی میں ترجمہ کردیں تو سبھوں کو سانپ سونگھ گیا۔ بالآخر سامعین کی اگلی صف سے ایک چودہ پندرہ سالہ بے ریش و بروت لڑکا جو شیروانی، ترکی ٹوپی اور انگریزی بوٹ میں ملبوس تھا قالین کو روندتا ہوا آگے بڑھا اور کھٹ کھٹ کرتا ہوا ڈائس پر چڑھ کر مائک ہاتھ میں لے کر یوں گویا ہوا ''نحن نترجم هذه المحاضرة ....'' پھر اس لڑکے نے عربی زبان میں وہ فصیح و بلیغ تقریر کی کہ اس کے آگے علامہ شبلی کی تقریر ماند پڑ گئی۔ مولانا جعفریؒ نے فرمایا کہ اس وقت ہمیں پتہ چلا کہ اسٹیج پر کھٹ کھٹ کرکے جانے والا کوئی لڑکا نہیں تھا بلکہ ''نحن'' تھا۔ یہی نحن ابوالکلام آزاد تھے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی ''ذکر آزاد'' میں ندوۃ العلماء کے ۱۹۱۲ کے ایک جلسہ کی روداد میں سید رشید رضا کی پوری تقریر سنے بغیر مولانا آزاد نے اس کا انتہائی فصیح و بلیغ اردو ترجمہ کرنے کا ذکر کیا ہے جس پر تمام ہی سامعین دنگ رہ گئے تھے۔ (۲۱)

مولانا کے انداز تحریر کے بارے میں ایک بات اور ذہن میں رہنی چاہیے کہ مولانا اصلاً خطیب تھے، اس لیے ان کی تحریر میں بھی خطابت کا انداز غالب تھا۔ ایجاز کے دعویٰ کے علی الرغم ان کی تحریروں میں اطناب کی فراوانی پائی جاتی ہے اور تقریروں کی طرح تکرار مطالب کی تو کثرت ہے۔ اگر ان کا انداز تحریری ہوتا تو اطناب اور تکرار سے بچا جاسکتا تھا۔

مولانا سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیتوں کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں:

''الف۔ لام۔ میم۔ یہ الکتاب ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ متقی انسانوں پر (سعادت کی) راہ کھولنے والی، (متقی انسان وہ ہیں) جو غیب (کی حقیقتوں) پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم نے جو روزی انہیں دے رکھی ہے اسے (نیکی کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ نیز وہ لوگ جو اس (سچائی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر (یعنی پیغمبر اسلام پر) نازل ہوئی ہے اور ان تمام (سچائیوں) پر جو تم سے پہلے (یعنی پیغمبر اسلام سے پہلے) نازل ہوچکی ہیں اور (ساتھ ہی) آخرت (کی زندگی) کے لیے بھی ان کے اندر یقین ہے، تو یقیناً یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے (ٹھہرائے ہوئے) راستہ

پر ہیں اور یہی ہیں (دنیا اور آخرت میں) کامیابی پانے والے"۔(۲۲)

ترجمان القرآن مولانا آزاد کی زندگی میں دوسری بار نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ لاہور کے جس اڈیشن سے یہ تفسیری ترجمہ لیا گیا ہے وہ نظر ثانی شدہ ہے۔ آپ ملاحظہ کریں گے کہ اس میں وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کا ترجمہ نہیں ہے۔ مالک رام نے اپنے مصحح اڈیشن میں بریکٹ میں اضافہ کیا ہے (اور نماز قائم کرتے ہیں) (۲۳) اور آخر میں حاشیہ میں نوٹ دیا ہے وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کا ترجمہ کاتب سے چھوٹ گیا تھا جو لکھ دیا گیا (۲۴)۔ ایسی فروگذاشتیں سہواً ہو جایا کرتی ہیں۔ ان پر نکیر نہیں کی جاتی۔ لیکن اسے آپ کیا کہیں گے کہ سورہ فاتحہ کی اس عظیم تفسیر میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفسیر سرے سے ہے ہی نہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی یہ تفسیر پڑھی تھی اور اس وقت اس کا ساہتیہ اکادمی کا اڈیشن نیز پاکستانی اڈیشن سامنے ہیں لیکن مذکورہ آیت کی تفسیر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ مولانا نے اس حذف کی نہ تو کوئی توجیہ پیش کی نہ ہی معذرت کا کوئی لفظ ان کی زبان سے برآمد ہوا۔ اس آیت کو مولانا نے اسی جلد میں دوسری جگہوں پر نقل کیا ہے اور ترجمہ بھی دیا ہے، نیز استعانت کے ذیل میں تقرب اور تزلف کی بھی رونمائی کی ہے لیکن قرآن میں عبادت کے اتنے مفاہیم پائے جاتے ہیں کہ جن کی نقاب کشائی مولانا کے لیے ضروری تھی۔ بعد کے مفسرین نے یہ کام کر دیا ہے۔ ہمیں کو نہیں بلکہ خود اس آیت کو شاید شکوہ ہو کہ مولانا نے اسے کیوں فراموش کر دیا۔

تفسیر سورہ فاتحہ کے بارے میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ سورہ فاتحہ میں دین حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص قرآن میں سے اور کچھ نہ پڑھ سکے، صرف اس سورہ کے مطالب ذہن نشیں کر لے جب بھی وہ دین حق اور خدا پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کر لے گا اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ماحصل ہے (۲۵)۔ مزید فرماتے ہیں "کائنات کی تعلیم اور سعادت انسانی جو جو کچھ ہے اس میں سب سے پہلی حقیقت یہی سورہ اور اسی سورہ کی سات آیتیں ہیں" (۲۶)۔ اسی لیے مولانا نے صفات الٰہیہ کے لیے ربوبیت، رحمت اور عدالت کے تین درجے قائم کیے ہیں اور سورہ فاتحہ کی پوری تفسیر انہیں صفات کے محور پر گردش کرتی ہے۔ مولانا نے صفات کی جو منطقی ترتیب قائم کی ہے اسے اچھی طرح نبھانے کی بھی کوشش

کی ہے۔ چونکہ وہ تمام کائنات کا رب ہے اور ربوبیت کی صفت رحم کو مستلزم ہے اس لیے اس نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کرلی ہے۔ آخرت میں وہ گنہگاروں کو سزا اس لیے نہیں دے گا کہ وہ قہار و جبار ہے بلکہ اس لیے کہ عدل کا تقاضا ہی یہی ہے کہ صفت جمال کے ساتھ جلال بھی ہوتا کہ خطا کاروں کو سزا دی جاسکے (۲۷)۔ یہ ساری باتیں معقول ہیں لیکن یہ دعویٰ کہ قرآن کی کل تعلیمات کا ماحصل یہی سورت ہے درست نہیں کیونکہ یہ سورت اصلاً ایک دعا ہے جس میں اللہ سے صراط مستقیم کی ہدایت طلب کی گئی ہے۔ اس صراط مستقیم کے تین اجزاء ہیں، ایک ایجابی اور دو سلبی۔ ایجابی یہ کہ راستہ ان لوگوں کا ہو جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔ سلبی یہ کہ راستہ ان لوگوں کا نہ ہو جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور یہ راستہ ان لوگوں کا بھی نہ ہو جو گم کردہ راہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ اس دعا کے جواب میں پورا قرآن سامنے رکھ دیتا ہے، جس میں عقائد بھی ہیں، عبادات بھی ہیں، احکام بھی ہیں، قوانین بھی ہیں اور عبرت کے لیے گذشتہ قوموں کے قصے بھی۔ اس لیے جب تک عمل کے لیے پورا قرآن سامنے نہ ہو دعا کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ مولانا نے جن صفات کی تفصیلات پر اپنا زور قلم صرف کیا ہے وہ تو دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت پر دلیل ہیں اور یہ دعا اس کی عظمت ہی کے واسطے سے مانگی گئی ہے۔ اگر اسی سورہ کو پورے قرآن کا خلاصہ تسلیم کرلیا گیا تو بندگی کے لیے ہمارے پاس کچھ نہ بچے گا اور اگر بچے گا تو فقط اتنا ہی جو اوروں کے لیے تو پورا مذہب ہوسکتا ہے لیکن مسلمانوں کے لیے شاید کچھ بھی نہیں۔

مولانا کی دعوت تعقل کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "کائنات خلقت کے مطالعہ اور تفکر سے انسان پر تخلیق بالحق کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے" (۲۸)۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ یہ اور اس قبیل کی دوسری بہت سی آیتیں انسان کو دعوت تفکر دیتی ہیں۔ مولانا نے ان آیات سے برہان ربوبیت پر استدلال کیا ہے۔ دیگر مفسرین نے بھی یہ باتیں کہی ہیں لیکن متعلقہ آیات کے سیاق میں، کیونکہ وہی اس کا محل ہیں۔

مولانا نظام ربوبیت سے وجود معاد پر استدلال فرماتے ہیں۔ ان کی یہ گفتگو کافی طویل ہے اور صفحہ ۷۵ سے ۸۲ تک کو محیط ہے۔ اس مبحث میں مولانا فرماتے ہیں کہ "وجود انسانی کرہ ارضی کے سلسلہ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے" (۲۹)۔ اس کی مزید توضیح کرتے ہوئے گویا ہیں:

''ماضی کے ایک نقطہ بعید کا تصور کرو جب ہمارا یہ کرہ سورج کے ملہب کرے سے الگ ہوا تھا۔ نہیں معلوم کتنی مدت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گزر گئی اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشوونما پاسکیں۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشوونما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی اور پھر نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اولین بیج وجود میں آسکا جسے پروٹو پلازم (protoplasm) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر حیات عضوی کے نشوونما کا دور شروع ہوا اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گزر گئی کہ اس دور نے بسیط سے مرکب اور ادنیٰ سے اعلیٰ تک ترقی کی منزلیں طے کیں، یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے کہ یہ سلسلہ ارتقاء وجود انسانی تک مرتفع ہوا۔ پھر انسان کے جسمانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک طویل مدت اس پر گزر گئی۔ بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقاء کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہوسکا جو کرہ ارضی کے تاریخی عہد کا متمدن اور عقیل انسان ہے''۔ (۳۰)

مولانا نے اصول ترجمہ و تفسیر کے ذیل میں فرمایا ہے:

''قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے انداز بیان، اپنے طریق خطاب، اپنے طریق استدلال، غرض کہ اپنی ہر بات میں ہمارے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں ہے اور نہ اسے پابند ہونا چاہیے'' (۳۱)۔ مزید فرماتے ہیں:

''انبیائے کرام کا طریق استدلال یہ نہیں ہوتا کہ منطقی طریقہ پر نظری مقدمات ترتیب دیں پھر اس کی بحثوں میں مخاطب کو الجھانا شروع کردیں۔ وہ برملا راست تلقین واذعان کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں...... لیکن ہمارے مفسروں کو فلسفہ و منطق کے انہماک نے اس قابل ہی نہ رکھا کہ کسی حقیقت کو اس کی سیدھی سادی شکل میں دیکھیں اور قبول کرلیں۔ انہوں نے انبیائے کرام کے لیے بڑی فضیلت اس میں سمجھی کہ انہیں منطقی بنادیں اور قرآن کی ساری عظمت اس میں نظر آئی کہ اس کی ہر بات ارسطو کی منطق کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نکلے'' (۳۲)۔ نیز یہ بھی:

''اسی تخم کے یہ بھی برگ وبار ہیں کہ سمجھا گیا کہ قرآن کو وقت کی تحقیقات علمیہ کا ساتھ دینا چاہیے، چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظام بطلیموسی اس پر چپکایا جائے ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل کے

دانش فروشوں کا طریق تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل قرآن پر چپکائے جائیں"۔(۴۳)

قرآن کریم میں تکوین انسانی کے بارے میں درجنوں آیتیں ہیں جن میں انسان کو کہیں مٹی سے، کہیں گارے سے اور کہیں پانی سے خلق کرنے کی بات کہی گئی ہے۔لیکن تفصیل انسانی کے لیے درج ذیل آیتیں ہمارے اثبات مقصد کے لیے کافی ہیں:

بلاشبہ ہم نے انسان کو بہتر ساخت پر پیدا کیا (التین:۴)۔ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔اس کو خشکی وتری میں سواری عطا کی اور پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر اس کو فضیلت دی، پوری پوری فضیلت (بنی اسرائیل:۷۰)۔کیا ہم نے نہیں دیں اس کو دو آنکھیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ؟ اور اسے دونوں راستے نہیں دکھائے؟ (البلد:۸تا۱۰)۔پھر اس کی بدی اور پرہیز گاری اس پر الہام کردی (الشمس:۸)۔نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی (القیامہ:۱و۲)۔اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں (البقرہ:۳۰)۔

اب تکمیل خلق انسانی کے موضوع پر مولانا کے ڈارونینی نظریہ ارتقاء کو دلیل بناتے ہوئے مولانا کا مذکورہ اصول تفسیر ملاحظہ فرمایئے، پھر قرآن کی درج بالا آیتوں کو سامنے رکھیے تو آپ کو خود معلوم ہوجائے گا کہ مولانا نے کس طرح خود نقض غزل کا ارتکاب فرمایا ہے۔

آیات قرآنی سے استشہاد کرتے ہوئے مولانا نے ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ انسان کے لیے پہلی راہ، ہدایت کی راہ تھی، گمراہی بعد میں آئی (۴۴)۔نیز یہ عنوان کہ ارتقائی نظریہ خدا کی ہستی کے اعتقاد میں نہیں بلکہ اس کی صفات کے تصورات کے مطالعہ میں مدد دیتا ہے، مولانا کی پوری گفتگو کو چیستاں میں تبدیل کردیتا ہے۔مولانا کی یہ پوری بحث نہ صرف اضطراب انگیز ہے بلکہ انقباض انگیز بھی ہے۔

الرحمٰن الرحیم کی تفسیر کے ذیلی عنوان اسلامی عقائد کا دینی تصور اور رحمت کے تحت تورات، انجیل اور قرآن کے بیانات کی توفیق میں مولانا کے یہاں اضطراب ہی نہیں بلکہ خلط مبحث بھی پایا جاتا ہے۔

اسی طرح اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر میں تشیع اور تحزب کی گمراہی اور تجدید دین

کی ضرورت کے عنوان کے تحت مولانا کی گفتگو تفصیلات سے اتنی پر اور اضطراب انگیز ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا کیا کہنا چاہتے ہیں! بالآخر اس کا حاصل انہیں کے الفاظ میں یہ برآمد ہوتا ہے کہ ”یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے کسی مذہب کے پیرو سے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کوئی نیا دین قبول کرلے بلکہ ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اپنے مذاہب کی حقیقی تعلیم پر جسے تم نے طرح طرح کی تحریفوں اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے، سچائی کے ساتھ کاربند ہو جاؤ۔ وہ کہتا ہے اگر تم نے ایسا کرلیا تو میرا کام پورا ہو گیا۔ لیکن جوں ہی تم اپنے مذہب کی تعلیم کی طرف لوٹو گے تمہارے سامنے وہی حقیقت آموجود ہوگی جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ میرا پیام کوئی نیا پیام نہیں ہے، وہی قدیم اور عالم گیر پیام ہے جو تمام بانیانِ مذہب دے چکے ہیں۔(۳۵)

اس کے بعد انہوں نے المائدہ کی آیات ۶۸، ۶۹ کا حوالہ دیا ہے جس کا ترجمہ انہیں کے الفاظ میں یہ ہے:

(اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو) اے اہل کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کی اور ان تمام صحیفوں کی جو تم پر نازل ہوئے ہیں حقیقت قائم نہ کرو، اس وقت تک تمہارے اس دین میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے (بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں تم دیکھو گے کہ) ان میں سے بہتوں کا کفر وطغیان اس کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ تو جن لوگوں نے انکار حق کی راہ اختیار کرلی ہے تم ان کی حالت پر بیکار کو غم نہ کھاؤ۔ جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں، جو یہودی ہیں، جو صابی ہیں، جو نصاریٰ ہیں (یہ ہوں یا کوئی ہو) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے عمل بھی نیک ہوئے تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے نہ کسی طرح کی غمگینی (المائدہ:۶۸، ۶۹)۔

اس کے بعد سورہ آل عمران کی آیات ۱۱۳ تا ۱۱۵ اور سورہ مائدہ کی مزید آیت نمبر ۶۶ سے استدلال کرتے ہیں۔(۳۶)

اس پوری گفتگو سے جس کا اختتام کہیں نہیں ہوتا بلکہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پھوٹتی چلی جاتی ہے یہ حاصل برآمد ہوتا ہے کہ نجات اور سعادت اخروی کے لیے فقط ایمان باللہ، ایمان بالآخر، معروفات پر عمل اور منکرات سے اجتناب کافی ہے۔ اس طرح مولانا نے سعادت وفلاح کی

راہ اتنی کشادہ کردی ہے کہ اس میں ایمان بالرسول کی حاجت ہی نہیں رہتی اور اس طرح تفریق بین الرسل کے خلاف مولانا نے خود قرآن کی جو آیتیں نقل فرمائی ہیں ان کا مدلول ضعیف بلکہ قریب الختم ہو جاتا ہے۔ اس بات کی تائید مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مولانا فرماتے تھے کہ "اللہ کی بخشش سبھوں کے لیے ہے کیونکہ سچائی ایک ہی ہے" (۳۷)۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی یہ تفسیر منکرین حدیث کے حلقہ میں بہت مقبول ہوئی ہے۔ تمام ادیان کی اصل تعلیمات میں وحدت دین پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا وحدت ادیان کی تائید کرنے لگتے ہیں جو ایک گمراہ کن عقیدہ ہے۔ یہی بات سورہ آل عمران کی آیات نمبر ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵ کی ان کی تفسیر سے ثابت ہوتی ہے۔ (۳۸)

مولانا جب یہ کہتے ہیں کہ اختلاف دین میں نہیں ہوا بلکہ شرائع میں ہوا ہے تو یہ ایک صحیح بات ہوتی ہے لیکن اسی بات کو جب وہ پھیلاتے ہیں تو اس کی وسعت میں وہ ساری گمراہیاں جائز ہو جاتی ہیں جو ادیان سابقہ میں در آئیں اور جن کی اصلاح کے لیے پے بہ پے انبیاء آتے رہے اور آخر کار اس سلسلہ کا اختتام ختم الرسل ﷺ کی آخری اور مکمل شریعت پر ہوا۔

تحویل قبلہ کے معاملہ کو بھی مولانا نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں وہ اہمیت نہیں دی جس کا وہ مستحق تھا (۳۹)۔ لیکن الحمدللہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۲ کے نوٹ میں اسے واضح کر دیا ہے (۴۰)۔ اگرچہ اس کی جو اہمیت ہے وہ اس سے ظاہر نہیں ہوتی۔

اسلامی تاریخ میں دراصل تین واقعات بہت اہم ہیں۔ ایک ہجرت، جس کی وجہ سے مدینہ میں ایک اسلامی حکومت قائم ہوئی، دوسرا تحویل قبلہ، جس کی رو سے بنی اسرائیل دنیا کی امامت کے منصب سے معزول کیے گئے اور یہ طرۂ افتخار امت مسلمہ کے سر پر آیا، تیسرے صلح حدیبیہ جس نے حکومت اسلامی کو پورے عرب میں پھیلانے کے علاوہ اس کی دعوت کو پوری متمدن دنیا میں پھیلا دیا۔ اس لحاظ سے ضروری تھا کہ تحویل قبلہ کے مقصد پر مفصل اور زیادہ واضح گفتگو کی جاتی۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ذکر آزاد میں مولانا کے اور کئی تفردات کا ذکر کیا ہے۔ چند ایک کا نقل کرنا حسب حال ہوگا۔

۱- مولانا قادیانیوں کو غیر مسلم نہیں سمجھتے تھے۔ ایک سوال کے جواب میں مولانا نے ملیح

آبادی کو اپنا مفصل جواب لکھوایا تھا جس میں ان کے دلائل تھے (۴۱)۔ واضح رہے کہ قادیانیوں کے دونوں گروہوں کو تمام عالم اسلام، اسلام سے خارج اور غیر مسلم سمجھتا ہے اور رابطہ عالم اسلامی اور حکومت پاکستان نے انھیں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا ہے۔

۲- مولانا تصویر اور مجسمہ سازی کو جائز فنون لطیفہ میں سمجھتے تھے۔ اس موضوع پر انہوں نے ملیح آبادی کو اپنا ایک مفصل مضمون پڑھنے کو دیا تھا جسے ملیح آبادی نے من وعن ذکر آزاد میں نقل کر دیا ہے (۴۲)۔ واضح رہے کہ مجسموں اور تصویروں کے بارے میں مسلم علماء کا موقف بہت سخت ہے۔ راقم الحروف کا بھی ایک مفصل مقالہ "تحقیقات اسلامی" (علی گڑھ) میں شائع ہو چکا ہے (۴۳)۔ مولانا کے فتوی کی بنیاد سورۂ سبا کی آیت نمبر ۱۳ ہے جو اس طرح ہے:

(اور جن) اس (حضرت سلیمان علیہ السلام) کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا، عمارتیں، تصویریں، لگن ایسے جیسے بڑے بڑے حوض اور اپنی جگہ جمی رہنے والی بھاری دیگیں۔ اے آل داؤد عمل کرو شکر کے ساتھ، اس آیت میں الفاظ محاریب اور تماثیل استعمال ہوئے ہیں، محاریب کا ترجمہ عام طور سے عمارتیں اور تماثیل کا تصویریں یا مجسمے کیا گیا ہے۔ لیکن مولانا ثناء اللہ امرت سری نے محاریب کا ترجمہ قلعے اور تماثیل کا ترجمہ نقشے کیا ہے (۴۴)۔ لیکن جن لوگوں نے اس کا ترجمہ عمارتیں اور تصویریں یا مجسمے کیا ہے انہوں نے بھی اسلامی شریعت میں تصویر کشی اور مجسمہ سازی کی حرمت میں دلائل دیے ہیں۔

۳- احادیث کی حجیت کے ذیل میں مولانا کے عجیب وغریب خیالات عامۃ المسلمین کے دلوں میں انقباض پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کیونکہ وہ صحیح احادیث کو دین میں حجت اور ادلہ اصولیہ میں سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں مولانا ملیح آبادی کا سوال اور مولانا آزاد کا جواب من وعن ملاحظہ ہو:

ملیح آبادی: ایک دن جیل میں مولانا سے عرض کیا حدیث کی تدوین تیسری صدی کے اوائل میں شروع ہوئی۔ دو سو سال تک زبانی روایت ہوتی رہی۔ روایت بھی لفظاً نہیں معناً۔ راوی اپنے فہم کے مطابق اپنے لفظوں میں روایت کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ آدمی کا فہم ضروری نہیں کہ صحیح ہو۔ پھر معلوم ہے کہ حضرت رسول ﷺ حدیث لکھنے کی ممانعت فرماتے تھے اور حضرت عمرؓ تو اپنے

عہد خلافت میں راویوں کی دروں سے خبر لیتے تھے۔ جب حالات یہ ہیں تو حدیث، قانون اور شریعت کا سرچشمہ کیوں کر مانی جاسکتی ہے؟

آزاد: فرمایا مولوی صاحب! آپ نے ٹھیک کہا۔ حدیث صحیح، عبادات میں تو حجت ہے۔ اخلاق و معاشرے کے سلسلے میں احادیث ایسی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مگر حدیث انسانی سوسائٹی کے لیے قانون کا سوتا نہیں ہوسکتی۔ عالم گیر ہدایت کا ضامن قرآن ہے اور قرآن معدودے چند قوانین کا حاصل ہے۔ یہ اس لیے کہ کوئی قانون بھی اختلاف ازمنہ و حالات کی وجہ سے ساری دنیا پر نہ نافذ ہوسکتا ہے نہ مفید ہوسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود منصوص قوانین قرآنیہ کے التوا کا اختیار امام المسلمین کو بخش دیا گیا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت عمرؓ نے منصوص قانون طلاق میں ترمیم کردی۔ عام الرمادہ میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع کیا کیونکہ لوگ قحط زدہ تھے اور مولفۃ القلوب کو مسلمانوں کا مال دینے سے انکار کردیا کہ اب اسلام طاقت ور ہو چکا ہے اور غیر مسلموں کے تالیف قلب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ حضرت عمرؓ کے یہ فیصلے صحابہؓ نے قبول کرلیے۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ دراصل شریعت کی اساس جلب مصالح اور دفع مفاسد پر ہے۔ (۴۵)

یہ مقام، حدیث کی حجیت پر کلام کرنے کا نہیں ہے لیکن اتنا بتادینا ضروری ہے کہ سائل کے تمام ہی قضایا غلط اور جہالت یا غلط فہمی پر دلیل ہیں اور مجیب کا جواب اگر اس کی نسبت مولانا کی طرف صحیح ہے تو فساد عقیدہ پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں اللہ اور رسول ﷺ کی علی الاطلاق اطاعت کا مطالبہ ہے۔ رسول کی اطاعت کا انکار دراصل قرآن کے انکار کو مستلزم ہے جس کے لیے خروج عن الاسلام کی وعید ہے۔ ارشاد باری ہے:

اور جو شخص رسول کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ (البقرہ: ۱۱۵)

منکرین حدیث کے اس تفسیر کو پسند کرنے کا غالب سبب اغلباً یہی ہے کہ وہ مولانا کو اپنا ہم مسلک سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا آزاد کے افکار اور ان کی تفسیر پر یہ اشکالات کچھ نئے نہیں ہیں۔علمائے کرام نے شروع ہی سے ان پر نکیر کی ہے۔خدا بخش لائبریری سمینار میں جو مقالات پڑھے گئے ان میں سے بعض میں ان اعتراضات کی جھلک ہے لیکن اس ذیل میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر، امید ہے کہ لوگوں کے لیے بار خاطر نہ ہوگا۔شاہ حسن عطا مرحوم فرزند شاہ حلیم عطا، سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ نے جو انگریزی، اردو، فارسی اور عربی کے زبردست مقرر تھے، اپنا واقعہ ہم لوگوں کو سنایا کہ جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کے صدر ہوئے تو ایک مرتبہ مولانا کا یونیورسٹی میں ورود ہوا اور یونین ہال میں انہوں نے طلبہ سے بھی خطاب فرمایا جس میں ان کی پاکستان نوازی پر تنبیہ ہی نہیں بلکہ تہدید کی۔اپنی جوابی میں تقریر شاہ حسن عطا نے نہ صرف مولانا کے سیاسی افکار کا تجزیہ کیا بلکہ ان کی تفسیر ترجمان القرآن کے پرخچے اڑا دیے۔یہاں تک کہ مولانا انتہا سے زیادہ خفا اور ناراض ہوکر وہاں سے رخصت ہوئے۔(۴۶)

ان چند کوتاہیوں کے علی الرغم یہ حسرت ہی رہی کہ کاش مولانا آزاد نے یہ تفسیر (ترجمان القرآن) مکمل کردی ہوتی کیونکہ اس کے تحقیقی نوٹس بہت ہی بیش قیمت ہیں اور ان سے علم کے سوتے پھوٹتے ہیں۔بیسویں صدی کے ربع اول میں قرآن فہمی کے میدان میں مولانا کو تقدم زمانی حاصل ہے۔اگرچہ خاکسار کے نزدیک اس سے مسلمانوں کی عملی طور سے کوئی اصلاح نہیں ہوئی اور غالباً مولانا کا یہ مقصد بھی نہیں تھا۔مولانا اس کے ذریعہ قرآن فہمی کی راہ ہموار کرنا چاہتے تھے اور یہ کام کسی نہ کسی درجہ میں پورا ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد جو تفسیریں وجود میں آئیں ان سے مسلمانوں کی اصلاح بھی ہوئی اور قرآن فہمی کا کام بھی آگے بڑھا۔بعد کے مفسرین نے اسلامی علم کلام سے کام لیتے ہوئے دین کی برتری ثابت کی اور اپنی تحریروں سے راہ عمل بھی فراہم کی۔لیکن بہرحال تقدم زمانی کا شرف ''ترجمان القرآن'' ہی کو حاصل ہے۔

چند کلمات ساہتیہ اکادمی سے بھی: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے مولانا کی تخلیقات کو شائع کرنے میں ترجمان القرآن کو اولیت دی تو یہ اس کا حق تھا۔لیکن ٹائپ کی چھپائی میں چار جلدوں میں کتابی سائز پر جس تکلیف دہ معیار سے یہ کتاب سامنے آئی ہے اس نے لوگوں کو بہت مایوس کیا ہے۔زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے اکادمی سے صرف اتنی گذارش ہے کہ آئندہ اسے تفسیری سائز

میں کمپیوٹر کی کتابت میں "تفہیم القرآن" کے طرز پر پیش فرمائیں، جس میں جلی قرآنی حروف میں صفحہ کے اوپر قرآن کا متن ہو، پھر جلی خط نستعلیق میں قرآنی عبارت کے اتنے ہی حصہ کا ترجمہ ہو، پھر اس کے نیچے قدرے خفی حروف میں اتنے ہی حصہ کی تفسیر ہو۔ نوٹس حسب سابق سورہ کے آخر میں حروف کی قدرے تبدیلی کے ساتھ شامل کیے جائیں لیکن اردو زبان کے لیے خط نستعلیق ہی استعمال کیا جائے۔ فہرست مضامین میں بھی پہلے عنوانات پھر شاہ سرخی، پھر سرخی، پھر ذیلی سرخیوں کے لیے الگ الگ سائز کے حروف استعمال ہوں تاکہ اپنے مطلب کی تقریر نکالنے میں آسانی ہو۔ سورتوں کے نمبر دینے کے بجائے سورتوں کے نام دیے جائیں کیونکہ محض نمبر سے سورتوں کی شناخت نہیں ہو پاتی۔ اگر ان مشوروں پر عمل کیا گیا تو انشاء اللہ لوگ اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

حواشی

(۱) ترجمان القرآن، ج۱، ساہتیہ اکادمی طبع سوم ۱۹۸۰ء، ص ۱۰۸، حاشیہ نمبر۱۔ (۲) یہ بات سلفی علماء کے درمیان متوارث رہی ہے، کسی کتاب میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ (۳) ملیح آبادی، ذکر آزاد، پہلا اڈیشن، فروری ۱۹۶۰ء، ص ۲۸۱ تا ۲۹۳۔ (۴) مولانا کی تفسیر سورۂ المومنون تک مطبوع تھی، مالک رام کے مطابق بعد میں مولانا کے کاغذات میں سورۂ النور کی تفسیر مل گئی اس لیے اسے بھی شامل کتاب کردیا گیا۔ (۵) شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی، دہلی۔ (۶) یہ پوری تفسیر اصلاً پاکستان میں شائع ہوئی ہے لیکن اس کا عکس لے کر اسے ہندوستان میں بھی شائع کیا گیا ہے، ناچیز کے پاس اس کی جلد اول کا ایک نسخہ ورلڈ اسلامک پبلی کیشنز دہلی کا شائع کردہ ہے جس میں یہ مقدمہ ۲۹ صفحات کو محیط ہے۔ (۷) ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، ج۱، مقدمہ ص ۱۳ تا ۴۰، شائع کردہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶، دسواں اڈیشن، فروری ۱۹۸۲ء۔ (۸) ان کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱- مقدمۃ التفسیر، راغب اصفہانی، مطبع جمالیہ، ۱۳۲۹ھ۔ ۲- مقدمۃ فی اصول التفسیر، ابن تیمیہؒ، دمشق، ۱۹۳۶ء۔ ۳- جواہر القرآن، الغزالی، کردستان، ۱۳۲۹ھ۔ ۴- الاتقان، جلال الدین سیوطی، مصطفیٰ حلبی، ۱۹۳۵ء۔ ۵- الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ ۶- مبادی التفسیر، محمد خضری دمیاطی، النیل، ۱۳۲۱ھ۔ ۷- المدخل المنیر، محمد حسنین مخلوف، مطبعۃ المعاہد، ۱۳۵۱ھ۔ ۸- التفصیل فی الفرق بین التفسیر

والتاویل، حامد العمادی، مخطوطہ۔ ۹- التفسیر معالم حیاتہ، امین الخولی، دار المعلمین، ۱۹۴۴ء۔ ۱۰- المذاہب الاسلامیۃ فی التفسیر، گولڈ زیہر، مطبعۃ العلوم، ۱۹۴۴ء۔ ۱۱- القرآن الکریم علی حسن عبدالقادر۔ ۱۲- اعجاز القرآن، مصطفیٰ صادق رافعی، الاستقامۃ، ۱۹۴۰ء۔ ۱۳- منہج الفرقان، محمد ابوسلامۃ، مطبع شبرا، ۱۹۳۸ء۔ ۱۴- مناہل العرفان، عبدالعظیم زرقانی، مطبع شبرا، ۱۳۵۹ھ۔ ۱۵- اکسیر فی اصول التفسیر، علامہ سید صدیق حسن خاں بھوپالی (ماخوذ از "تاریخ تفسیر و مفسرین" از غلام احمد حریری، فیصل آباد، ۱۹۷۸ء، ص ۳۶۷، نیز ص ۱۰)

(۹) ایضاً۔ (۱۰) کشف الظنون ۲۳۰/۱، بحوالہ تاریخ تفسیر و مفسرین، ص ۲۶۸۔ (۱۱) ایضاً، ص ۲۶۹۔ (۱۲) ایضاً، ص ۲۷۱۔ (۱۳) ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادمی، ۴۴/۱۔ (۱۴) ایضاً، ص ۴۵۔ (۱۵) تاریخ تفسیر و مفسرین، ص ۷۔ (۱۶) ملاحظہ ہو تحقیقات اسلامی علی گڑھ، شمارہ جولائی تا دسمبر ۱۹۹۰ء۔ (۱۷) دیباچہ طبع اول، ص ۴۸۔ (۱۸) ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادمی، ۷/۱۔ (۱۹) ایضاً، ۱۱/۱۔ (۲۰) عبدالرزاق ملیح آبادی، ذکر آزاد، پہلا اڈیشن، فروری ۱۹۶۰ء، دفتر آزاد ہند کلکتہ، ص ۱۷۔ (۲۱) ذکر آزاد، ملیح آبادی، ص ۱۹۔ (۲۲) ترجمان القرآن، ج ۱، اسلامی اکادمی، لاہور، بدون تاریخ، ص ۲۲۷۔ (۲۳) ترجمان القرآن، ج ۲، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، تیسری بار ۱۹۸۰ء، ص ۳۔ (۲۴) ایضاً، ص ۸۱۷۔ (۲۵) ایضاً، ص ۵۔ (۲۶) ایضاً، ص ۶۱۔ (۲۷) ایضاً، ص ۱۱۔ (۲۸) ایضاً، ص ۵۶۔ (۲۹) ایضاً، ص ۷۶۔ (۳۰) ایضاً، ص ۷۶، ۷۷۔ (۳۱) ایضاً، ص ۳۲۔ (۳۲) ایضاً، ص ۳۹۔ (۳۳) ایضاً، ص ۴۰، ۴۱۔ (۳۴) ایضاً، ص ۲۵۰۔ (۳۵) ایضاً، ص ۴۱۷۔ (۳۶) ایضاً، ص ۴۱۷ تا ۴۱۹۔ (۳۷) ملاحظہ ہو ذکر آزاد، ملیح آبادی، ص ۲۶۱ تا ۲۶۳۔ (۳۸) ترجمان القرآن، ۳۴۷/۲، ۳۴۸۔ (۳۹) ایضاً، ۳۶۸/۱ تا ۳۷۱۔ (۴۰) ایضاً، ۱۰۴/۲۔ (۴۱) ملاحظہ ہو، ملیح آبادی، ص ۲۶۳ تا ۲۶۷۔ (۴۲) ایضاً، ص ۲۳۳ تا ۲۳۹۔ (۴۳) تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء۔ (۴۴) تفسیر ثنائی، دار الکتاب، دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۵۱۴۔ (۴۵) ذکر آزاد، زیر عنوان "حدیث و قرآن"، ص ۲۳۲، ۲۳۳۔ (۴۶) اس واقعہ کی تصدیق شاہ حسن عطا کے چھوٹے بھائی مولانا شاہ شبیر عطا، سجادہ نشین درگاہ سلون (رائے بریلی) سے کی جاسکتی ہے جو ناچیز کے پرانے دوستوں میں سے ہیں، اس کا ذکر پاکستان کے کسی صحافی نے بھی اپنی کتاب میں "ذکر شاہ حسن عطا" کے ذیل میں کیا ہے، بدقسمتی سے کتاب اور مصنف کا نام یاد نہیں رہ گیا، کتاب جناب ندیم صدیقی صاحب (مشہور شاعر اور صحافی) ممبرا (ممبئی) کے پاس موجود ہے۔

اخبار علمیہ

روزنامہ "ایکسپریس ٹریبون" کی اطلاع ہے کہ پاکستانی شہر جہلم اور اس کے مضافات میں ایک شخص سے نوسو سالہ قدیم قلمی نسخہ قرآن مجید دستیاب ہوا ہے، مشہور ماہر آثار قدیمہ غلام اکبر ملک کو ایک معمر شخص نے یہ تاریخی نسخہ قرآن تحفۃً دیا، یہ پاپیرس پر تحریر کیا ہوا ہے، موجودہ کاغذ کی ایجاد سے قبل کاغذ کی جگہ یہی پاپیرس استعمال ہوتا تھا، جس کو چین نے ایجاد کیا تھا، ملک صاحب کا بیان ہے کہ اس کی کتابت بارہویں صدی عیسوی کے سراج الدین ابوطاہر محمد بن محمد بن عبدالرشید نے کی ہے، یہ ۱۲ سو صفحات پر مشتمل تقریباً پانچ کلو وزنی ہے، اتنی قدامت کے باوجود صرف بعض مقامات پر روشنائی ہلکی ہوئی ہے، ماہرین کا خیال ہے کہ اس کی کتابت میں تین خطاطوں نے ایک برس صرف کیا ہوگا، غالباً اس قدر قدیم نسخہ اتنی اچھی حالت میں پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔

کچھ عرصہ قبل معارف نے سعودی عرب میں ایک خاتون یونیورسٹی کے قیام کی خبر دی تھی، اب دنیا کی اس پہلی خاتون یونیورسٹی کا افتتاح شاہ عبداللہ کے ہاتھوں ہوگیا ہے، حکومت نے اس کو "نورا بنت عبدالرحمٰن یونیورسٹی" کے نام سے موسوم کیا ہے، یہ ریاض میں ۸ ملین اسکوائر میٹر کیمپس پر محیط ہے، جس میں پچاس ہزار طالبات کے بیک وقت ۱۸ شعبوں میں حصول تعلیم کی گنجائش ہے، یونیورسٹی میں ہمہ وقت روشنی اور صاف صفائی کے لیے سولر پلانٹ اور اس کے احاطہ کو ماحولیاتی آلودگی سے پاک کار اور موٹو ریل کا انتظام کیا گیا ہے، ۸ سو بیڈ والا شفاخانہ اور ۱۲ ہزار طالبات کے لیے دارالاقامہ بھی تعمیر کیا گیا ہے، ضرورت پڑنے پر ویڈیو کانفرسنگ کے ذریعہ پروفیسروں کی خدمات لی جائیں گی۔

برطانیہ کے پرائمری اسکولوں سے متعلق حکومت کی جانب سے ایک عجیب و غریب رپورٹ سامنے آئی ہے کہ وہاں ہر روز ۴ سے ۶ سال کی عمر کے بچے اپنے بڑوں سے بدسلوکی اور اساتذہ پر حملہ کے جرم میں نکال دیے جاتے ہیں، ۲۰۰۸ء اور ۲۰۰۹ء کی شائع شدہ اکیڈمک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پہلے اور دوسرے سال میں ۶۲۰ بچوں کا اپنے بڑوں پر حملے اور سب و

شتم کے جرم میں اخراج کیا گیا، گذشتہ ۲ برسوں میں ۲۸۹۰ واقعات سامنے آئے اور اس طرح دو برسوں میں اس قسم کے واقعات میں ۱۹ فیصد کا اضافہ ہوا، ۶۰ ۷ واقعات پر تشدد اور ۱۰۱۷، اپنے ساتھیوں کو نشانہ بنانے کے رویہ کے تھے، ۹۰ کو تکلیف دہ شرارت، ۴۰ کو جنسی بے راہ روی اور ۲۰ بچوں کو چوری کے سبب اسکول سے باہر کیا گیا، ان میں کچھ کو عارضی اور کچھ کو مستقل طور سے اسکول سے الگ ہونا پڑا، ماہرین کا خیال ہے کہ والدین اور اساتذہ کے نرم رویوں، شفقت کے نام پر بے جا آزادی، والدین کی دوسرے مشاغل میں مصروفیت اور ان کی جانب سے بے توجہی اور بچوں کا ٹی وی اور کمپیوٹر سے غیر معمولی لگاؤ اس صورت حال کے اہم اسباب ہیں۔

آرہاس یونیورسٹی ڈنمارک کے شعبہ سیاسیات نے ''اسلام بحیثیت مذہب ڈنمارک کے لیے خطرناک ہے'' کے موضوع پر ایک سروے کرایا، جس میں ۶۲ فیصد افراد نے اس سے اختلاف اور ۳۰ فیصد نے اتفاق کیا اور اس تیس فیصد میں ۳۰ سال سے کم عمر نوجوانوں کی صرف ۱۷ فیصد تعداد نے اسلام کو ڈنمارک کے لیے خطرہ بتایا، ۳۶ فیصد نے مسلمانوں سے شادی کو ناپسند کیا اور ۸۷ فیصد نے کہا کہ ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہمارے پڑوس میں مسلمان ہیں یا عیسائی۔ ۴۶ فیصد نے مسلمانوں کی موجود مشکوک اور متنازع صورت حال کا ذمہ دار خود مسلمانوں کو بتایا جب کہ ۴۱ فیصد نے اس سے اختلاف کیا، یہ جائزہ ''صراط مستقیم'' برمنگھم میں شائع ہوا ہے۔

اردو زبان میں اسلامی تعلیمات کا سرمایہ جس قدر ہے بہ جز عربی کے شاید ہی کوئی دوسری زبان اس کی مثال پیش کر سکے، پچھلے دنوں اردو سے متعلق ایک نہایت اندوہ ناک خبر یہ آئی کہ بہار کے بلاک استھاواں کے ایک مشہور تاریخی گاؤں ''جاناں'' جس کو مسلم نوابوں اور بڑے بڑے زمین داروں کی نسبت کا فخر حاصل ہے اور جس کے بعض آثار آج بھی اس گاؤں کی اردو تہذیب کی یاد دلاتے ہیں، اب وہاں کا ایک شخص بھی اردو زبان سے آشنا نہیں، حالانکہ بہار کا شمار ہندوستان کے ان صوبوں میں ہوتا ہے جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

''اخبار تحقیق'' پاکستان کی یہ خبر توجہ کے قابل ہے جس میں کیوبا کے قائد فائیڈل کیسٹرو نے بڑے پیمانے پر مسلمان سائنس دانوں کی ہلاکت پر دنیا کی افسوس ناک خاموشی پر سوال اٹھایا

ہے، خبر کے مطابق ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۶ء کے درمیان تقریباً ۵۵۰ مسلمان سائنسدانوں اور محققین کی ہلاکت میں اسرائیلی ایجنسی موساد کا ہاتھ تھا، عراقی سائنس دانوں کی ایک بڑی تعداد کی ہلاکت کا مسئلہ اس قدر سنگین تھا کہ اس پر غور وفکر کے لیے ۲۰۰۶ء میں اسپین کے شہر میڈرڈ میں بین الاقوامی کانفرنس ہوئی اور اس میں ایک ایک مہلوک سائنس داں اور اس کی خدمات کے بارے میں تفصیلی معلومات کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا گیا، واضح رہے کہ تیس برس قبل ۱۹۸۱ء میں اسرائیل نے فضائی حملہ کے ذریعہ عراق کے (ODIRAK) نیوکلیر پلانٹ کو تباہ کردیا تھا، عراق کے بعد اسرائیل کی نگاہ اب ایرانی سائنس دانوں پر ہے، چنانچہ ۲۰۰۷ء میں ڈاکٹر ارسے، شیر حسین پوکا اصفہان کے نیوکلیر سنٹر میں مردہ پائے جانے، نومبر ۲۰۱۰ء میں ایرانی نیوکلیر سائنس داں مجید شریعری کے جنوری ۱۱ء میں اپنے گھر سے باہر نکلتے ہوئے بم کی زد پر آجانے کو اسرائیل کی گہری سازش کے طور پر دیکھا جارہا ہے، رپورٹ کے مطابق الجزیرہ نے پہلے ہی عراقی سائنس دانوں کی ہلاکت میں موساد کے کردار کا انکشاف کیا تھا، اب فائیڈل کیسٹرو نے ایرانی سائنس دانوں کی ہلاکتوں پر اپنے خیالات کا برملا اظہار کر کے اسرائیل کی سازش کو بے نقاب کرتے ہوئے عالمی ضمیر کو بیدار کرنے اور اسرائیل کی علم دشمنی سے باخبر کرنے کی کوشش کی ہے۔

امریکہ کے سینٹر برائے سائنس مفاد عامہ کی جانب سے جاری کردہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کیارامل کیمیکل کو مشروبات میں استعمال کیا جاتا ہے جو صحت کے لیے اس قدر نقصان دہ ہے کہ اس کے مستقل استعمال سے کینسر کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، کیارامل نامی کیمیکل شکر سے تیار کیا جاتا ہے، شکر کے علاوہ اس میں امونیا بھی شامل ہے، حیوانات پر تحقیق سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ یہ انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ سائنس سے وابستہ محققین نے ایف بی آئی سے درخواست کی کہ وہ ان تمام کیمیاوی اشیاء پر پابندی عائد کرے جو صحت کے لیے مضر اور مشروبات کے لیے قابل استعمال ہوں۔

ک، ص اصلاحی

ادبیات

حضرت مولانا ظفیر الدین مفتاحیؒ
سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کی یاد میں

جناب وارث ریاضی صاحب

کس نے پائی ہے جہانِ علم و دانش میں وفات؟ رو رہے ہیں جس کے غم میں آج مردانِ ثقات

مفتیِ دینِ مبیں دنیا سے کیا رخصت ہوا؟ اک نیا غم آرزو[1] کے بعد پھر سہنا پڑا

زندگی کیا ہے؟ مسلسل رنج و غم کھانے کا نام یا فراقِ رفتگاں میں اشک برسانے کا نام

ہے خدا باقی مگر فانی ہے اس کی کائنات چند لمحوں کے لیے ہے رونقِ بزمِ حیات

رہ برِ قوم و وطن اے منبعِ علم و عمل ترجمانِ ملتِ بیضا ، فقیہِ بے بدل

تیری رحلت پر حزیں ہیں علم کے مہر و نجوم تیرے غم میں آج ہے محوِ فغاں[2] دارالعلوم

پیکرِ صبر و رضا اے عالمِ روشن خیال انکساری میں کہیں ملتی نہیں تیری مثال

اے بہارِ آگہی ، اے نازشِ علم و ہنر تیری ہر تصنیف ہے گل دستۂ فکر و نظر

اے صحافت[3] کے زعیمِ بے مثال و معتبر تھی زمانے کی سیاست پر تری گہری نظر

تھی تری ہستی سلیمانؒ[4] کی نظر[5] سے مستطاب بوالمآثر (۶) کے کمالِ علم و فن سے فیض یاب

جانشینِ عبد[7] رحمٰن، داعیِ امن و اماں یادگارِ حضرتِ گیلانیِ[8] شیخِ زماں

حضرت میر شریعت[9] تیرے غم میں سوگوار تیری فرقت میں ولیِ[10] نیک خو ہیں اشک بار

محوِ غم سجاد[11] ہیں ، حماد[12] بھی ، عباد[13] بھی مبتلائے غم سعود[14] و وارثِ ناشاد بھی

از جہاں در دو ہزار و دہ و یک ، وارث حسن[15] ۲۰۱۱ء شد بہ جنت آں ظفیرِ عالمِ شیریں سخن

---

(۱) پروفیسر مختار الدین احمد آرزو۔ (۲) دارالعلوم دیوبند۔ (۳) مفتی صاحب نے ایک عرصے تک ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کی ادارت کی خدمت انجام دی اور بڑے فکر انگیز اداریے تحریر کیے۔ (۴) حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ جن سے مفتی صاحب نے علمی و فکری رہنمائی حاصل کی۔ (۵) بہ معنی توجہ و التفات۔ (۶) ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ جن سے مفتی صاحب نے اسلامی علوم کا درس لیا۔ (۷) حضرت مولانا عبدالرحمٰنؒ امیر شریعت خامس جو مفتی صاحب کے چچازاد بھائی تھے ، مدرسہ حمیدیہ گودنا چھپرہ میں (بقیہ حاشیہ ص ۴۷۷ پر)

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن بہار ۸۴۵۴۵۳۔

قطعۂ تاریخ وفات

دانشمندِ سرشناختۂ زبانِ فارسی در ہند

پروفسور امیر حسن عابدی

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

دریغا ، امیر حسن عابدی	بہ عمر نود سالگی فوت شد
اساتید را ، اوستاد مہین	در آموزش فارسی ، فوت شد
شناسندۂ قدرِ اہلِ ہنر	شرف دار دیدہ وری فوت شد
پژوہندۂ شاعرانِ کہن	در این روزگار نوی فوت شد
معلم ، محقق ، نویسندہ ای	ادیب زبانِ دری فوت شد
نوشت آنکہ صدہا مقال و کتاب	بہ اردو و ہم فارسی ، فوت شد
نگہدارِ فرہنگِ ایران زمین	در این کشورِ ہندوی ، فوت شد
چو در روزنامہ بخواندم رئیس	کہ آن صاحبِ آگہی فوت شد
ہماندم تفکر نمودم بہ سال	کہ آن مردِ خوش طبع کی فوت شد
دلم گفت : با "سی و یک آہ" گو :	"امیر حسن عابدی فوت شد"
۶ + ۳۱ = ۱۸۶	۱۲۴۶

۱۲۴۶ + ۱۸۶ = ۱۴۳۲ھ (۲۰۱۱م)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷۶ کا) مفتی صاحب نے ان سے ہدایہ اور مشکوۃ شریف وغیرہ کی تعلیم پائی تھی۔ (۸) حضرت مولانا مناظر حسن گیلانی جن سے مفتی صاحب نے علمی استفادہ کیا اور ان کی سوانح "حیات گیلانی" تالیف کی۔ (۹) حضرت مولانا سید نظام الدین مدظلہ امیر شریعت بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ جن سے حضرت مفتی صاحب سے گہرے روابط تھے۔ (۱۰) حضرت مولانا ولی رحمانی نائب امیر شریعت و سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر جو مفتی صاحب سے بڑے عقیدت مند ہیں۔ (۱۱ تا ۱۳) حضرت مفتی صاحب کے صاحب زادگان جو مفتی صاحب کی طرح صاحب علم ہیں۔ (۱۴) پروفیسر سعود قاسمی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو حضرت مفتی صاحب کے عزیز رشتے دار ہیں اور حضرت مفتی صاحب کے ساختہ و پرداختہ بھی۔ (۱۵) راقم ناچیز کا اصلی نام۔

گوشۂ مطالعات فارسی، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱۔

مطبوعات جدیدہ

گلدستہ خوش باس: از جناب اسلم مرزا، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۳۱۸، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ: میزان پبلی کیشنز، وہائٹ ہاؤس، شاہ سراج روڈ، سٹی چوک، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱۔

اردو زبان کا خمیر سب سے پہلے کہاں تیار ہوا؟ اس سوال کے متعدد جوابات ہوسکتے ہیں، لیکن اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان غزل گو شاعر ہونے میں وؔلی دکنی غیر متنازع ہیں، ارض دکن میں غواصی و شاہی، یزدی و نصرتی اور محمد قلی قطب شاہ کی مملکت سخن کی توسیع ان کے نصیب میں آئی، لیکن جب وہ دلی آئے تو اقلیم سخن پر ان کی حکمرانی، صاحبان تخت و تاج کی طرح، پورے ملک میں تسلیم کی گئی، ساڑھے تین سو سال پہلے دکنی لب و لہجہ سے دلی کے رنگ کی یہ منتقلی ولی کی کرامت نہیں ہے تو کیا ہے کہ

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا   شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

اے بے خبر اگر ہے بزرگی کی آرزو   دنیا کی رہ گزر میں بزرگوں کی چال چل

جسے عشق کا تیر کاری لگے   اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

ولی کو ولی سمجھنے والوں کی کمی نہیں، تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے ان سے ان کی شان کے مطابق اعتنا کیا، اب یہ تازہ کتاب ولی کے ایک خوش فکر و خوش نظر ہم وطن کی ایسی کاوش ہے جو ولیات میں منفرد کہی جاسکتی ہے، فاضل مصنف نے نو ابواب کو خوبصورت عناوین دیے جیسے گل گلزار عاشقاں، آہنگ زبان دل، عکس آئینہ خیال، نقاش رنگ آمیز، بلبل رنگیں بیاں، بر مزار ما غریباں، نگاہ پاک بازاں، دامن گل چیں اور بہار آرائے باغ جاں اور بالترتیب ان عنوانوں کے تحت شعرائے متقدمین کے وہ اشعار جو ولی کی شان میں ہیں یا جنہوں نے ولی کی زمین میں غزلیں کہیں یا ولی کے مصرعوں پر تضمینیں کہیں اور جن کا سلسلہ متقدمین سے عصر حاضر تک ہے، ان سب کے اشعار جمع کردیے ہیں، احمد آباد میں ولی کے مزار کو بے نام و نشان کرنے کی مذموم حرکت پر احتجاجی شاعری بھی پیش کردی گئی، اس میں ہندی، گجراتی شاعروں کی نظموں کا اردو ترجمہ بھی ہے، اس دلکش اور دلچسپ

پیش کش سے فاضل مولف نے اپنے حسن ذوق کے ساتھ حسن عقیدت کی عمدہ مثال مہیا کردی ہے، یہ امید قطعی بجا ہے کہ "اردو کے بلند نظر قارئین اس گلدستہ خوش باس کو پسند کریں گے"۔

غبار شیشہ ساعت: از جناب ابرار اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن، خالص پور، اعظم گڈھ ۲۷۶۱۳۸۔

تاریخ واقعی خود کو دہرانے کے عمل سے باز نہیں آتی، بیدل کو گزرے ایک زمانہ ہوا، ان کو اپنے قدح کو پر کرنے کے لیے شیشۂ ساعت کے غبار کی ضرورت پیش آئی کہ بیدل کی داخلی شخصیت خارج کے مظاہر سے متصادم ہوتی رہی، شاعری کسی کی ہو ذات کے شعور اور جذبات کے بے پناہ تنوع کی پیکر تراشی ہی ہوتی ہے لیکن جب شئے کی حقیقت کو دیکھنے والی نظر میسر ہو تو شیشہ ساعت میں وہ عکس بھی نظر آتا ہے جو خود کلامی کے کرب کو الہامی لذت کے نشاط سے ہم آہنگ کردیتا ہے اور یہیں سے نظر بھی قدوسی ہوتی ہے اور لہجہ بھی کروبی ہوتا جاتا ہے، حیرانی شاعر کو کیسے کیسے آئینہ خانوں کے مقابل کرتی ہے، آئینہ دل کو توڑ کر اس کے جوہر کی تلاش کا حوصلہ بس کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے، قدامت و روایت کے شانوں پر وجود کی سواری ہو یا جدیدیت و مابعد جدیدیت کا بار اٹھانا ہو، صداقت ازلی کی تلاش میں سب یکسا ذی شان ہو جاتا ہے، یہ مجموعہ اشعار اس کا ثبوت ہے، ٹوٹے پھوٹے جملوں سے مرکب نظمیں، شعری لطافت سے ممکن ہیں خالی ہوں لیکن احساس اس خلا کو کس طرح آباد کرتا ہے وہ ان نظموں سے ظاہر ہے، لیکن اصل حیرت و مسرت تو غزل کے چمن خوش باس کی گلگشت سے ملتی ہے۔

ہر طرف غم کے چھائے ہیں بادل   ان کی آنکھیں ہیں آج پرنم کیا
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی اک پیکر جمال   جو داستان گو بھی ہو خود داستاں بھی ہو
عجیب پرسش غم ہے عجب ہے سوز دروں   دلوں کے زخم خود اپنا عذاب لکھتے ہیں

بوئے گل کی بے قراری میں قرار پانے والوں کے لیے یہ مجموعہ نعمت سے کم نہیں۔

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱- غالب اور ہماری تحریک آزادی (دوسرا ایڈیشن): شمیم طارق، سیفی بک ایجنسی ۱۰/۱۱، امین بلڈنگ، ۵۳/ ابراہیم رحمت اللہ روڈ ممبئی ۴۰۰۰۰۳۔ قیمت ۲۰۰/ روپے

۲- غالب کے منتخب فارسی مکتوبات (اردو ترجمہ): پرتو روہیلہ، غلب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی، ۲۔ قیمت ۲۵۰/ روپے

۳- علامہ محمد اقبال کی اردو شاعری...... (انتخاب): مصنف کا نام درج نہیں، آئی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور۔ قیمت ۸۰/ روپے

۴- الاں ہماں تے موڑواں الاہماں (شکوہ جواب شکوہ کا منظوم پنجابی ترجمہ): محمد انور رانیق، ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور۔ قیمت ۲۰۰/ روپے

۵- اقبال کا تصور تاریخ: ڈاکٹر راشد حمید، ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور۔ قیمت ۳۰۰/ روپے

۶- اقبال کا پہلا خطبہ، علم اور مذہبی تجربہ تحقیقی و توضیحی مطالعہ: ڈاکٹر محمد آصف اعوان، ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور۔ قیمت ۲۵۰/ روپے

۷- فکر اقبال (اقبال کے فارسی کلام پر جامع تبصرہ، بحث و تجزیہ): ابن احمد نقوی، مکتبہ نعیمہ، صدر بازار، مئو ناتھ بھنجن۔ قیمت درج نہیں

۸- اردو نظم کے سلسلے: علیم صبا نویدی، مرتبہ ڈاکٹر جاوید حبیب، نور جنوب سہ ماہی چنائی -۵۔ قیمت ۵۰۰/ روپے

۹- اکلوتا فرزند ذبیح اسحاق یا اسماعیل: عبدالستار غوری، ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری المورد K-51، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ قیمت ۳۳۰/ روپے

۱۰- سبد گل (خاکے): ڈاکٹر عبدالمقیت شاکر علیمی، رہبر پبلیشرز، اردو بازار کراچی۔ قیمت درج نہیں

۱۱- اقبال اور مشاہیر کشمیر: کلیم اختر، ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور۔ قیمت ۱۵۰/ روپے

۱۲- مقاصد شریعت: محمد نجات اللہ صدیقی، ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان۔ قیمت ۳۰۰/ روپے